جنوری
۲۰۱۱ء

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر: ڈاکٹر مُحمد امین

ماہنامہ **الـبرہان**

جلد ۱۷، شمارہ ۱ جنوری ۲۰۱۱ء/ صفر ۱۴۳۲ھ

مشمولات

تاریخ کا جبر	ادارہ	۲
○ہمارا دینی تناظر		
توہین رسالت — دروس و عبَر	مدیر	۳
○تفہیم مغرب: اسلام اور جدید ٹیکنالوجی		
جدید مغربی ٹیکنالوجی اقدار کُش ہے	ڈاکٹر محمد امین	۸
اسلام اور جدید ٹیکنالوجی	ڈاکٹر جاوید اقبال ندیم	۳۸
اسلام اور جدید ٹیکنالوجی کا چیلنج	خضر یاسین	۴۳
بجلی سے چلنے والی منشیات	ڈاکٹر مشتاق گوہر	۴۵
موبائل فون: مضرات و نقصانات	خالد جامعی	۵۰
ٹی وی یا اخلاقی ٹی بی	مدیر	۵۴
میڈیا: برائی کی جڑ یا دعوت کا ہتھیار	محمد عاصم حفیظ	۵۸
○ڈائیلاگ	خالد جامعی	۶۶

تاریخ کا جبر

ساتھی نے پوچھا: آج آپ کچھ اداس لگتے ہیں۔ میں نے کہا: ہاں۔ اس نے کہا: اگر کوئی بہت پرسنل معاملہ نہ ہوتو مجھے بھی شریک کر لیجئے کہ کہنے سننے سے دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے۔ ہم نے کہا کوئی ایسی ذاتی بات نہیں، معاملہ صرف یہ ہے کہ ہم برسوں سے اصلاح تعلیم کی اور اصلاحی تعلیمی اداروں کے قیام کی جو باتیں کہتے آرہے ہیں اس میں یہ بھی شامل تھا کہ تعلیم کوئی تجارت کی چیز نہیں چنانچہ ثنویت کے خاتمے، مغربیت سے بچنے اور اسلامی تربیت کے لیے جو رول ماڈل تعلیمی ادارے ہم قائم کرنا چاہتے تھے ان کے لیے ہم نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ ان میں طلبہ سے فیس لی جائے گی اور عوام سے ان میں سرمایہ کاری کے لیے کہا جائے گا۔ لیکن پچھلے دنوں تحریک اصلاح تعلیم کے ایک اجلاس میں اکثر ساتھیوں نے نئے تعلیمی اداروں کے قیام کے لیے اسے ناگزیر قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ تاریخ کا جبر ہے جسے قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ان کا مؤقف تھا کہ جب حکومت کو اس کام سے دلچسپی نہیں اور اللہ کی راہ میں دینے والے مخیر پاکستانی حضرات صرف روایتی مدرسہ ومسجد ہی کو دینی اور ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور دینی تعلیم کی اصلاح اور جدید تعلیم پر خرچ کرنے کو وہ دینی کام اور ثواب کا کام ہی نہیں سمجھتے تو آپ مذکورہ ادارے کیسے قائم کریں گے اور بفرض محال آپ قائم کر بھی لیں تو مستقل طور پر انہیں چلائیں گے کیسے؟ آپ کو اتنے عطیات اور وہ بھی مستقل طور پر کہاں سے ملیں گے اور کون دے گا کہ آپ کا مجوزہ سکول، یونیورسٹی اور اسلامک سنٹر چل سکے؟

انہوں نے ہماری اس رائے کو کہ ہم لوگوں تک پہنچ نہیں سکے اور انہیں اس کام کے لیے آمادہ اور مطمئن نہیں کر سکے اور اس کے لیے مزید کوششوں کی ضرورت ہے، رد کرتے ہوئے کہا کہ یہی وجہ ہے کہ آپ آج تک نئے تعلیمی ادارے قائم نہیں کر سکے اور اصلاح تعلیم کا جو کام آپ کر رہے ہیں وہ بھی سسک رہا ہے پھل پھول نہیں رہا اور آپ کی توانائیاں اسے کھینچ تان کر چلانے اور بچانے میں صرف ہو رہی ہیں جس سے آپ کے علمی کاموں کا بھی حرج ہو رہا ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ ہمیں کمرشل ماڈل کے اندر رہتے ہوئے لیکن اس کی کمزوریوں سے بچتے ہوئے جتنی زیادہ سے زیادہ تعلیمی اصلاح ممکن ہو اس کے لئے کوشش کرنی چاہیے۔ ان کے بقول جب آپ کے پاس طلبہ ہی نہیں ہوں گے تو آپ تربیت کن کی کریں گے اور جب اپنے تعلیمی ادارے نہیں ہوں گے تو نئے نصاب کا تجربہ کہاں کریں گے؟ اس پر ہم خاموش ہو گئے اور انہوں نے ہماری خاموشی کو نیم رضامندی سمجھتے ہوئے اس کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

اور اب ہم اس فکر میں غلطاں ہیں کہ اگر ہم نے اس کمپرومائز کو قبول کرلیا تو مزید کتنے کمپرومائز ز منہ کھولے ہمارے راستے میں کھڑے ہوں گے؟ امین

ڈاکٹر محمد امین

توہین رسالت ـــ دروس وعِبَر

۴ جنوری ۲۰۱۱ء کو پنجاب کے گورنر سلمان تاثیر کو توہین رسالت کے الزام میں قتل کر دیا گیا۔ اس واقعے کے حق میں اور اس کے خلاف ردعمل کا سلسلہ جاری ہے۔ اس اہم واقعے سے ہم جو سبق سیکھتے ہیں وہ یہ ہیں:

میڈیا کا غیر اسلامی کردار

۵ جنوری کو پنجاب گورنمنٹ نے چھٹی کا اعلان کر دیا اور تعلیمی ادارے بند ہو گئے لہٰذا ہمیں اس موضوع پر معروف ٹی وی چینلز کی نشریات دیکھنے کا موقع ملا۔ ہم حیران رہ گئے کہ سارے چینلز یک طرفہ طور پر حکومتی مؤقف پیش کر رہے تھے اور کسی کو بھی یہ ہمت اور توفیق نہ ہو رہی تھی کہ وہ عوام کا اور دینی حلقوں کا مؤقف پیش کرتا۔ یا یوں کہیے کہ پاکستانی سیاست کی سیکولر ایلیٹ اور میڈیا کا مؤقف ایک ہو گیا تھا۔ اگرچہ یہ معروف ہے کہ ہمارے الیکٹرانک میڈیا کا کردار بالعموم نہ صرف غیر اسلامی اور غیر تعمیری ہے بلکہ سیکولر اور مغرب زدہ ہونے کی بنا پر اسلام مخالف بھی ہے تاہم اس تجربے و مشاہدے سے اس خوفناک حقیقت کا احساس ہمیں شدت سے از سرِ نو ہوا۔

اس موقع پر ہمیں اس ضرورت کا احساس بھی شدت سے ہوا کہ دینی قوتوں کے پاس اپنا میڈیا چینل ضرور ہونا چاہیے تا کہ وہ صحیح نقطۂ نظر عوام کے سامنے لا سکیں اور یہ چینل کسی ایک مسلک یا مکتب فکر کا نہیں بلکہ ایسا ہونا چاہیے جو مسالک سے بالا تر ہو کر اسلام کی بات کرے یا مختلف مکاتب فکر کا متفقہ مؤقف پیش کرے۔ اور ٹی وی چینل چلانے کے لیے چونکہ بہت زیادہ مالی وسائل درکار ہوتے ہیں اس لیے ابتدا میں اگر چینل نہ سہی کوئی پروڈکشن ہاؤس ہی بن جائے تو کم از کم صحیح نقطۂ نظر پیش کرنے کی کوئی

خصوصی اشاعت

☆ البرہان کا یہ شمارہ 'اسلام اور جدید ٹیکنالوجی کا چیلنج' کے موضوع پر خصوصی شمارہ ہے۔

☆ اگلا شمارہ ان شاء اللہ 'توہین رسالت' کے موضوع پر خصوصی شمارہ ہوگا۔

مدیر

صورت تو نکلے!

عوام اور حکمرانوں میں بُعد

دوسری چیز جس کا ہمیں شدت سے احساس ہوا وہ یہ تھا کہ مسلم معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ حکمران اور عوام میں بُعد ہے۔ حکمران مغربی تہذیب کے علمبردار ممالک کے نرغے میں ہیں جو نام تو جمہوریت کا لیتے ہیں لیکن انہیں دراصل مسلم ممالک میں اپنے مہرے درکار ہوتے ہیں خواہ وہ فوجی ڈکٹیٹر ہوں یا سیاستدان۔ حقیقی جمہوری تجربہ انہوں نے اپنے معاشرے کے لیے رکھا ہوا ہے۔ ہمارے حکمرانوں کی بے بصیرتی اور بے حمیتی یہ ہے کہ وہ اقتدار میں آنے اور رہنے کے لیے اپنے عوام کی طاقت پر بھروسہ نہیں کرتے بلکہ امریکہ و یورپ کی حمایت پر انحصار کرتے ہیں۔ ہمارے سامنے ایران کی مثال ہے کہ وہ ڈٹ گیا تو امریکہ اور یورپ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا لیکن یہ صرف اس لیے ممکن ہوا کہ وہاں عوام اور حکمرانوں میں بُعد نہیں یکجائی ہے۔ یہ تجربہ اگر دیگر مسلم ممالک میں بھی کیا جائے تو اس کا نتیجہ یہی نکلے گا لیکن ہمارے حکمران خواہ فوجی کمانڈر ہوں یا سیاسی بزرجمہر سب حسینۂ مغرب کی زلف کے اسیر ہیں اور دینی غیرت و ملی حمیت سے تہی داماں ہیں۔ اگرچہ ایسا اتفاقاً نہیں ہو رہا بلکہ یہ سب مغربی تہذیب کے علمبردار ممالک کی باقاعدہ پلاننگ و کوشش کا نتیجہ ہے جس میں مغربی استعمار نے محض چولا بدلا ہے اور طریق کار تبدیل کیا ہے ورنہ اس کا ہدف آج بھی اسلام اور مسلم دشمنی ہے۔ مسلم علماء، سکالرز اور دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ امت کو اس مہیب مسئلے کے گڑھے سے نکالنے کی تدبیریں سوچیں ورنہ اس کے بغیر مغرب کے شکنجے سے نکلنا، اپنے پیروں پر کھڑے ہونا اور اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو پانے کی راہ تلاش کرنا ایک خواب ہی رہے گا۔

اسلام اور مغربیت کی کشمکش

اس واقعے سے ایک اور سبق جو ملا وہ یہ تھا کہ اسلام اور مغربیت کی کشمکش آج بھی پاکستانی اور مسلم معاشرے میں زوروں پر ہے۔ اہل مغرب نے مغربی فکر و تہذیب کو دنیا کے مختلف ممالک خصوصاً مسلم معاشروں کو برآمد کرنے کے لیے تعلیم، میڈیا، ٹیکنالوجی، جمہوریت، تجارت، گلوبلائزیشن جیسے بہت سے محاذ (out lets) کھول رکھے ہیں اور انہوں نے مسلم معاشرے کے بہت سے طبقات مثلاً سیاستدانوں، بیوروکریسی، فوج، میڈیا، ادب و صحافت وغیرہ میں اپنے کارندے پھیلا رکھے ہیں جو مغربی

تہذیب کے اثرات وصول کر کے انہیں آگے مسلم معاشرے میں پھیلاتے ہیں۔ یوں اسلام اور مغربیت میں کشمکش کی جو لہر بیسویں صدی میں شروع ہوئی تھی آج بھی زوروں پر ہے۔ اور اس کے خاتمے کی صورت صرف یہی ہے کہ مسلم معاشرے کے افراد الٰہی ہدایت یعنی اپنے دین اور اپنی اقدار پر یکسو ہوجائیں اور دنیا میں ترقی یا کسی بھی دوسرے بہانے سے اہل مغرب کی طرف دیکھنا ترک کردیں۔ قانون توہین رسالت کی حیلے بہانے مخالفت صرف وہی افراد کررہے ہیں جو مغرب زدہ اور سیکولر ہیں جب کہ پاکستانی عوام کی بہت بڑی اکثریت اس چیز کا تصور بھی نہیں کرسکتی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کی جائے۔

توہین رسالت کے قانون کی تقدیس اور مؤثر نفاذ

حال ہی میں اخبارات میں ایک رپورٹ سامنے آئی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ جب سے توہین رسالت کا قانون پاس ہوا ہے تب سے آج تک توہین رسالت کے ایک ہزار واقعات عدالتوں تک پہنچے لیکن ان میں سے کسی شخص کو بھی موت کی سزا نہیں دی گئی۔ دوسری طرف عوام نے مشتعل ہوکر ان میں سے ۳۷ افراد کو موت کی سزا دے دی جبکہ کئی کیسوں میں مغربی ممالک نے ملزمان کو بچانے کی کوشش کی اور انہیں مغربی ممالک میں پناہ دی۔ اس رپورٹ سے تین نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں: **ایک یہ** کہ قانون توہین رسالت پر مؤثر طریقے سے عمل درآمد نہیں ہورہا حالانکہ حکومت خصوصاً عدالتوں اور پولیس کا فرض ہے کہ جب توہین رسالت کا کوئی کیس سامنے آئے تو پھر اس پر مؤثر طریقے سے کاروائی ہو۔ پولیس مؤثر طریقے سے کیس بنائے اور ٹھوس ثبوت مہیا کرے اور عدالتیں مؤثر سزا دیں جب کہ یہ مشاہدے میں آیا ہے کہ نچلی عدالتیں سزائیں دیتی ہیں لیکن اعلیٰ عدالتیں ایسے مجرموں کو اکثر بری کردیتی ہیں۔ **دوسرے یہ** کہ جس طرح ۳۷ ملزموں کو عوام نے سزا دی خصوصاً سلیمان تاثیر کو قتل کیا گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان عوام اس کے لیے بھی تیار نہیں ہیں کہ کوئی اس قانون پر انگلی اٹھائے یا اس کو غیر مؤثر کرنے کی کوشش کرے۔ اس کا ایک ہی حل ہے کہ اس قانون کو مقدس قرار دے دیا جائے اور اس پر تنقید ممنوع قرار دی جائے بلکہ اس کے خلاف رائے زنی کرنے والے کے لیے سزا مقرر کردی جائے تاکہ کوئی اس قانون سے چھیڑ چھاڑ کی جرأت ہی نہ کرے ورنہ اس کا حشر سلیمان تاثیر جیسا ہوسکتا ہے۔ اس طرح کے قوانین یورپ میں بھی موجود ہیں جیسے مثلاً ہولوکاسٹ کے خلاف رائے زنی کرنے والا مستوجب سزا ہوتا

ہے اسی طرح توہین رسالت کے خلاف بولنے یا لکھنے والا بھی مستوجب سزا ہونا چاہیے۔ **تیسرے یہ کہ** مغربی ممالک کو اس معاملے سے دور رہنا چاہیے۔ انہیں احساس ہونا چاہیے کہ مسلمان اس مسئلے میں بہت جذباتی ہیں لہٰذا اگر وہ توہین رسالت میں ملوث ہوں گے یا مسلم حکمرانوں پر دباؤ ڈالیں گے اور سیکولر لوگوں کو ہلاشیری دیں گے یا ایسے مجرموں کو بچانے اور اپنے ملکوں میں پناہ دینے کی کوشش کریں گے تو مسلمانوں کی نفرت کا نشانہ بنیں گے لہٰذا اہل مغرب کو نفرت کے پھیلاؤ کا سبب نہیں بننا چاہیے۔

شبہات واعتراضات

قانون توہین رسالت کے حوالے سے بعض مغرب زدہ سیاستدانوں، دانشوروں اور صحافیوں نے علم کی کمی، سیکولر اپروچ اور خلطِ مبحث کی وجہ سے عامۃ الناس کے ذہنوں میں بہت سے سوالات، شبہات اور اعتراضات پیدا کر دیئے ہیں۔ ہم ان کا ذکر یہاں کیے دیتے ہیں اور ان شاء اللہ ان کے جوابات بھی البرہان میں شائع کریں گے:

قرآن ۱۔ اس سزا کا ذکر قرآن حکیم میں موجود نہیں

حدیث ۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سراپا شفقت و رحمت تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا۔ وسیرت ہم کون ہوتے ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے گستاخ کو سزا دینے والے!

۳۔ کوئی صحیح حدیث ایسی نہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے امت کو حکم دیا ہو کہ جو میری گستاخی کرے اسے موت کی سزا دو

فقہ ۴۔ فقہاء اس پر متفق نہیں ہیں کہ یہ حد ہے اور اس کی سزا صرف موت ہے تو اسے تعزیر سمجھ کر کم سزا کیوں نہیں دی جاسکتی؟

۵۔ جب بعض فقہاء اس کے قائل ہیں کہ مجرم کی توبہ قبول کی جاسکتی ہے اور اسے معاف کیا جاسکتا ہے تو ہم ایسے مجرم کو معاف کیوں نہیں کر دیتے جب وہ معافی مانگے؟

٦۔ 'توہین' کی تعریف کیا ہے؟ کیا صریح سبّ وشتم کرنے والے اور ایسے شخص میں فرق کیا جائے گا جس کے منہ سے کوئی ایسا لفظ نکل گیا ہو جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جلالت شان کے مطابق نہ ہو؟

۷۔ کیا ایک ایسے آدمی میں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی توہین کا عادی ہو، اس پر مصّر ہو اور اس کے صدور پر معافی نہ مانگے اور ایک دوسرا شخص جو عادی نہیں محض بحث وغیرہ کے دوران حالت

اشتعال میں اس کے منہ سے کوئی ایسا کلمہ نکل جائے جو آپ ﷺ کی جلالت شان کے مطابق نہ ہو، وہ صدور کے بعد معافی مانگے اور دوبارہ ایسا نہ کہنے کا وعدہ کرے؟ کیا ان دونوں کی سزا میں فرق ہوگا یا نہیں اور کیا اس ضمن میں احناف کا مؤقف دوسروں سے نرم ہے؟

۸۔ کیا اس جرم میں مسلم اور غیر مسلم میں فرق کیا جائے گا؟ کیونکہ کسی مسلمان سے مستبعد ہے کہ وہ جناب ﷺ کی توہین کرے اور اس پر مصّر ہو؟

۹۔ کیا یہ قانون پچھلے چودہ سو سال میں امت میں موجود رہا ہے اور اس پر عمل درآمد ہوتا رہا ہے؟ اور اس پر عمل درآمد کی نوعیت کیا رہی ہے؟ کیا معاملہ عدالت میں جاتا تھا یا جس مسلمان کے سامنے توہین کا واقعہ ہو وہ مجرم کو قتل کر دینے کا حق دار ہوتا تھا؟ کیا ایسے قاتل پر عدالت میں کبھی مقدمہ چلا ہے؟ کیا اس قانون کے غلط استعمال پر کیس مسلمان قاضیوں کے پاس گئے ہیں؟

۱۰۔ پہلی امتوں میں بھی کیا انبیاء کی توہین کی سزا موت تھی؟

۱۱۔ کیا یہ صحیح ہے کہ یہ قانون ضیاء الحق جیسے فوجی آمر کے دور میں بنایا گیا تھا اور اس سے قانون پہلے یہ پاکستان اور برصغیر کے قانونی ڈھانچے میں موجود نہ تھا؟ کیا وجہ ہے کہ یہ قانون پہلے موجود نہ تھا اور حال ہی میں بنایا گیا؟

۱۲۔ یہ قانون بنیادی انسانی حقوق کے خلاف ہے؟ بنیادی انسانی حقوق کے اقوام متحدہ کے چارٹر کے خلاف ہے جس پر پاکستان نے دستخط کیے ہیں۔

۱۳۔ موجودہ قانون کی سزا (یعنی عمر قید یا سزائے موت) بطور حد ہے یا بطور تعزیر؟ اگر یہ بطور حد ثابت نہ ہو تو تعزیراً کیا سزا دی جاتی ہے؟

۱۴۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے اور معمولی جرائم کو مسلمان معاف کیوں نہیں کر دیتے اور اس معاملے میں صَرفِ نظر سے کام کیوں نہیں لیتے کیونکہ یہ ضروری تو نہیں کہ ہر معاملہ عدالت ہی میں لے جایا جائے جبکہ شریعت حدود کے نفاذ کی حریص نہیں۔ آپ ﷺ سے نفاذ حدود سے اِعراض ثابت ہے اور آپ ﷺ کا حکم ہے کہ شبہات سے حدود کو ٹالو۔ لہٰذا آج کے مسلمانوں کا یہ رویہ صحیح نہیں کہ اس نوعیت کا ہر معاملہ ضرور ہی عدالت میں جانا چاہیے اور ضرور ہی مجرم کو سخت سزا ملنی چاہیے۔

۱۵۔ اگر ایک مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں موجود ہو اور کوئی اس کے سامنے توہین رسالت کا ارتکاب کرے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ کیا اسے اس شخص کو قتل کر دینا چاہیے؟

> صفاء اسلامک سنٹر نے کچھ ماہ پہلے 'اسلام اور جدید ٹیکنالوجی کا چیلنج' کے موضوع پر ایک علمی مذاکرے کا اہتمام کیا تھا جس میں کلیدی مقالہ مدیر البرہان نے پیش کیا تھا اور اس پر تبصرہ وتنقید ایجوکیشن یونیورسٹی کے استاد فلسفہ جناب ڈاکٹر جاوید اقبال ندیم صاحب اور اسلامی فلسفہ کے سکالر جناب حضر یاسین صاحب نے کی۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر امجد وحید صاحب نے ادا کیے تھے۔اس مذاکرے میں پیش کیے جانے والے مقالات پیش خدمت ہیں۔ ادارہ

۱۶۔ اس قانون سے پاکستان کی بدنامی ہورہی ہے اور یہ الزام لگایا جارہا ہے کہ پاکستانی مسلمان انتہاپسند اور دہشت گرد ہیں۔اس کا توڑ کیا ہے؟

۱۷۔ کیا اس طرح کا قانون دوسرے مسلمان ممالک میں بھی موجود ہے اور وہاں اس پر عمل درآمد ہوتا ہے؟

۱۸۔ مسلمان اس معاملے میں اتنے جذباتی کیوں ہیں کہ وہ ایسے آدمی کو خود قتل کر دیتے ہیں۔اسے عدالت میں لے کر کیوں نہیں جاتے کہ جرم ثابت ہونے پر مجرم کو عدالت سزا دے۔

۱۹۔ نچلی عدالتیں اتنی سخت سزائیں کیوں دیتی ہیں جن کی توثیق اعلیٰ عدالتیں نہیں کرتیں؟

۲۰۔ پاکستان میں آج تک توہین رسالت کے مرتکب کسی شخص کو سزائے موت کیوں نہیں ہوئی ؟ مطلب یہ کہ جب قانون موجود ہے تو اس پر مؤثر طریقے سے عمل درآمد کیوں نہیں ہوتا؟ آج تک پاکستان میں کسی چور کا ہاتھ اور ڈاکو کا پاؤں نہیں کٹا اور کوئی زانی سنگسار نہیں ہوا جب کہ یہ 'حدود' قانون میں موجود ہیں اور ان جرائم کا ارتکاب ہمارے معاشرے میں عام ہورہا ہے؟

علمی مذاکرہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد امین

جدید مغربی ٹیکنالوجی اقدار کُش ہے

حال ہی میں امریکہ نے اپنے ہوائی اڈوں پر ایسے سکینرز (scanners) نصب کر دیئے ہیں جو کسی بھی مسافر کی بے لباس تصویر کھینچ سکتے ہیں جسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے اور جس میں جسم کے ہر حصے کو بڑا کر کے دیکھا جا سکتا ہے اور یہ تصویر رنگین بھی ہوسکتی ہے۔امریکہ نے سیکورٹی اور دہشت گردی

کے خلاف مزعومہ جنگ کے نام پر ایسے سکینرز نہ صرف اپنے ہوائی اڈوں پر نصب کر دیئے ہیں اور یورپ میں بھی ان کا استعمال شروع ہوگیا ہے بلکہ وہ انہیں اپنے زیر اثر طفیلی ممالک، خصوصاً وہ جو دہشت گردی کے خلاف مزعومہ جنگ کی لپیٹ میں ہیں (جیسے پاکستان) کو بھی بھجوانا چاہتا ہے کہ وہ بھی انہیں اپنے ہوائی اڈوں پر نصب کریں— اور جیسا کہ ماضی کا تجربہ ہے کہ یہ ممالک جلد یا بدیر اور کچھ مزاحمت کے بعد اسے قبول کر لیں گے۔

پھر جیسا کہ ہم سب کا مشاہدہ ہے کہ کوئی نئی ٹیکنالوجی جب مارکیٹ میں آتی ہے تو ابتداءً مہنگی ہوتی ہے لیکن مینوفیکچررز اور صنعتکاروں کے پیش نظر چونکہ محض بزنس اور منافع ہوتا ہے لہٰذا ان کا مارکیٹنگ اور سیلز کا شعبہ اور اشتہاری کمپنیاں اسے عام کرنے اور ہر آدمی کے لیے اسے ناگزیر بنانے اور ثابت کرنے میں لگ جاتی ہیں چنانچہ ہر نئی پروڈکٹ کو عوام میں متعارف کرا کے اس کی سیلز بڑھا دی جاتی ہے اور ہمارے یہاں تو اس سکینر کی ضرورت آسانی سے ثابت کی جا سکتی ہے کیوں کہ دہشت گرد اپنے جسم کے ساتھ بم باندھ کر صرف ہوائی جہاز ہی میں سوار نہیں ہوتے بلکہ خودکش جیکیٹس پہنے گلیوں اور بازاروں میں بھی گھومتے رہتے ہیں تاکہ اپنے ٹارگٹ پر پہنچ کر دھماکہ کر سکیں۔ اس رجحان اور ضرورت کے تحت توقع ہے کہ جلد ہی ان سکینرز کا سائز چھوٹا کر کے انہیں متحرک اور موبائل بنا دیا جائے گا تاکہ سیکورٹی اہل کار اسے اپنی جیب میں ڈالے رکھیں اور کیمرے اور دوربین کی طرح جب بھی ضرورت محسوس کریں اسے استعمال کر لیں اور دہشت گرد مجرم کی شناخت کر کے اسے پکڑ لیں۔ شروع میں یہ سکینر یا کیمرہ سیکورٹی اہل کاروں کے پاس ہوگا پھر جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، بزنس، مارکیٹنگ اور منافع کی خاطر بہت جلد یہ اوپن مارکیٹ میں آجائے گا اور ہر موبائل فون میں فٹ ہو سکے گا اور ہر آدمی اور ہر نوجوان کی دسترس میں ہوگا۔ یوں ایک نوجوان جب چاہے گا اپنے محبوب کی بے لباس تصویر اپنے موبائل کیمرے میں محفوظ کر لے گا اور وہ ہر آدمی کی دسترس میں ہوگی۔ یہ ہے مغربی ٹیکنالوجی کا وہ تازہ ترین کارنامہ یا پیش رفت جسے ابلیس نے پہلے مرحلے میں ''ایک حقیقی ضرورت'' کے تحت ایجاد کروایا ہے اور پھر اسے وہ حیاء، عفت اور پاکیزگی جیسی اسلامی اور اخلاقی اقدار کے خاتمے اور فحاشی، عریانی اور زناء کو عام کرنے کے لیے معاشرے میں پھیلا دے گا۔

اس صورت حال نے کئی سوالات کو جنم دیا ہے مثلاً یہ کہ کیا مغربی ٹیکنالوجی خلاف اسلام ہے؟ اور اگر یہ خلاف اسلام ہے تو پھر مسلمانوں کا رویہ اس حوالے سے کیا ہونا چاہیے؟ اور آئندہ اس طرح کی

صورت حال سے بچنے کے لیے مسلم معاشرے اور ریاستوں کو کیا لائحہ عمل اپنانا چاہیے؟ اس موضوع پر غور کے لیے ہم نے اس مضمون کو چار مباحث میں تقسیم کیا ہے:

۔ ایک یہ کہ سائنس وٹیکنالوجی کے حوالے سے اسلام کا مؤقف کیا ہے؟

۔ دوسرے یہ کہ اس ضمن میں مغرب نے کیا راہ اپنائی ہے؟

۔ تیسرے یہ کہ مغرب کے موجودہ (پوسٹ ماڈرنسٹ) دانشور اور فلاسفرز اس طرح کے مغربی طرز عمل کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں؟

۔ چوتھے یہ کہ اس صورت حال میں مسلم امت اور معاشرے کا ردعمل کیا ہونا چاہیے؟

اب ہم ان چاروں مباحث پر کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے، واللہ المستعان۔

مبحث اوّل: سائنس وٹیکنالوجی کے حوالے سے اسلام کا مؤقف

۔ اسلام انفس و آفاق کے مطالعے [(1)] اور اس کے نتیجے میں تسخیر کائنات اور ایجادات بالفاظ دیگر سائنس وٹیکنالوجی کی حمایت کرتا ہے جس کا ایک لازمی نتیجہ تمدنی ترقی اور انسانی سہولیات میں اضافہ ہے۔

۔ لیکن انفس و آفاق کے مطالعے، کائنات پر غور وفکر، سیروا فی الارض اور انسانی مشاہدے و تجربے کا نتیجہ قرآن حکیم کے مطابق لازماً یہ ہونا چاہیے کہ وہ انہیں اللہ تک پہنچائے اور انسانوں کی ہدایت کے لیے اس کے پیکج اور 'حق' (توحید، رسالت اور آخرت پر مبنی شریعت اور زندگی گزارنے کا مکمل لائحہ عمل) کے ادراک کی معرفت بہم پہنچائے۔ [(2)]

۔ لہٰذا اسلامی عقیدے اور ورلڈ ویو (تصور انسان، تصور کائنات اور تصور الٰہ) کے نتیجے میں جو نظریۂ علم اور فلسفۂ علم (epistemology) وجود میں آتا ہے اور اس نظریۂ علم سے علوم وفنون کا جو ڈھانچہ (body of knowledge) تشکیل پاتا ہے وہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا موید ہے۔ [(3)]

۔ اور مسلمانوں نے جب ایک ہزار سال تک دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی تو میرٹ پر کی اور وہ صرف اپنے مستحکم سیاسی نظام، بہترین معاشی ڈھانچے، انصاف مہیا کرنے والی عدلیہ، سماجی ہم آہنگی پر مبنی اعلیٰ معاشرتی نظام، اسلحے کی برتری اور جہادی جذبے کی حامل فوج۔۔۔وغیرہ کی وجہ ہی سے نہیں کی بلکہ وہ اس وقت علوم وفنون اور خصوصاً سائنس وٹیکنالوجی میں بھی دوسری اقوام سے کہیں آگے تھے جس کا اندازہ مندرجہ ذیل امور سے کیا جا سکتا ہے:

۱۔ مسلمانوں نے اتنا ہی نہیں کیا کہ یونانی اوررومی تہذیب سے موصول ہونے والی علمی وسائنسی پیش رفت کومحفوظ رکھا بلکہ انہوں نے اسے آگے بڑھایا،اس میں خاطرخواہ اضافے کیے اور اسے یورپ تک پہنچایا جس نے سائنس وٹیکنالوجی کو بام عروج تک پہنچا دیا۔

۲۔ سائنس خصوصاً ٹیکنالوجی میں آج جو ہوشربا پیش رفت ہمیں نظر آتی ہے،اس کا ابتدائی کام مسلمان سائنسدانوں نے کیا ہے مثلاً کیمرا(جو آج کی ٹیکنالوجی میں اہم کردار رکھتا ہے)مسلم سائنسدان ابن الہیثم (م 1040ء) نے ایجاد کیا۔آج ہوائی جہاز میں سفر معمول کی بات ہے جب کہ اس کے لیے گلائیڈر اور پیرا شوٹ کے کامیاب تجربات کی ابتداء مسلم سائنسدان اور انجنیئر عباس بن فرناس(م887ء) نے اندلس میں 852ء میں کی تھی۔آج مشینری میں جو پیش رفت ہو چکی ہے اس کی بنیاد مسلمان انجنیئر الجزری (م1206ء) نے رکھی تھی جب اس نے کرینک شافٹ ، والو اور پسٹن ایجاد کیے، اس نے ڈنکی پمپ(پانی کھینچنے کی موٹر) اور دنیا کی پہلی مکینیکل واچ بنائی اور اسی لیے اسے روبوٹکس اور آٹو میٹس کا بانی کہا جاتا ہے۔میکانیات کے سلسلے میں مسلمان انجنیئر احمد بن موسیٰ بن شاکر کا کام قابل ذکر ہے جس کی تصنیف کتاب الحیل(مصنفہ 860ھ) میکانیات پر دنیا کی اولین کتاب ہے جو تخلیقی انداز میں ایک سو میکانکی آلات کی ایجاد کا موجب بنی ہے۔آج کل ہسپتالوں کے آپریشن تھیٹروں میں جو اوزار استعمال ہوتے ہیں ان میں سے اکثر مشہور مسلمان سرجن ابوالقاسم الزہراوی (م1000ء) کی ایجاد ہیں جس نے 200 سے زائد میڈیکل اوزار ایجاد کیے جن میں آنکھوں کے نازک آپریشن کے آلات بھی شامل تھے۔جابر بن حیان(م850ء) نے 800ء میں عمل کشید(destillation) کے لیے آلات ایجاد کیے اور اپنی لیبارٹری میں ان کا کامیاب تجربہ کیا۔گندھک اور شورے کے تیزاب بھی اسی کی ایجاد ہیں۔کیمیائی صنعت میں اس کی جدتوں کی بنیاد پر اسے جدید کیمیا کا بانی کہا جاتا ہے۔ویکسینز کا طریق علاج 1724ء میں ایک برطانوی سفارت کار کی بیوی نے ترکی سے سیکھا اور یورپ میں مروج کیا۔ہوائی چکی (wind mill) ایرانیوں نے 634ء میں ایجاد کی اور اس سے گندم پیسنے اور آبپاشی کے لیے پانی اوپر کھینچنے کا انتظام کیا اور اس طرح ہوا کو بطور انرجی استعمال کرنے کی ٹیکنیک ایجاد کی۔

ڈیفنس انڈسٹری میں زرہ بکتر بنانے کا فن مسلمانوں نے عروج پر پہنچایا اور صلیبی جنگوں میں یورپیوں نے اسے مسلمانوں ہی سے سیکھا۔جنگوں میں بارود کے استعمال کو بھی مسلمانوں نے رواج

دیا اور خالص قلمی شورے (نائٹرک ایسڈ) کا استعمال شروع کیا جو بارود کا جزو اعظم ہے۔ راکٹ اور تارپیڈو بھی مسلمان سائنسدانوں کی ایجاد ہیں۔ جیالوجی میں زمینی محیط کی درست پیمائش کا سہرہ بھی مسلمانوں کے سر ہے۔ الادریسی (م1155ء) نے سسلی میں 1139ء میں دنیا کا پہلا گلوب بنایا جس میں زمین کو گول دکھایا گیا تھا۔ ہیئت وفلکیات (سپیس سائنس) میں مسلمانوں کی ترقی تو محیر العقول تھی۔ مسلم دنیا میں رصدگاہوں کی کثرت تھی اور ابن مکنہ نے مصنوعی چاند بنایا جو باقاعدگی سے طلوع ہوتا اور روشنی دیتا تھا۔ فاؤنٹین پین بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے جو 935ء میں مصر کے سلطان کے کہنے پر مقامی انجنیئروں نے ایجاد کیا تھا۔ اعداد میں اعشاری نظام اور سکوں کی منتقلی کی بجائے چیک لکھنے کا رواج بھی مسلمانوں کی ایجاد ہے۔ مسلمان سائنسدانوں نے سوڈیم ہائیڈروآکسائیڈ اور خوشبوؤں کو ملا کر صابن بنانے کا آغاز کیا۔ شیمپو بنانے کا تجربہ ایک ہندی مسلمان نے 1759ء میں برطانیہ میں کیا [4] یہ چند مثالیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں ورنہ ان کی تفصیل کے لیے کئی دفتر درکار ہیں۔

۳۔ سائنس وٹیکنالوجی میں مسلمانوں کی ترقی وعظمت کا اعتراف انصاف پسند یورپین محققین اور مفکرین بھی کرتے ہیں چنانچہ ڈریپر(John Draper) کہتا ہے: ''تجرباتی علوم میں مسلمانوں نے علم کیمیا کی بنیاد رکھی اور کیمیا کے کچھ اہم ترین متعاملات جیسے سلفیورک ایسڈ اور الکحل دریافت کیے۔ انہوں نے طب پر اس علم کا اطلاق کیا۔ سب سے پہلے کتاب الادویہ یا قرابادین شائع کرنے والی یہی لوگ تھے۔ انہوں نے اس میں معادن کی تیاری کے طریقے بھی بتائے۔ میکانیات میں انہوں نے نیچے گرنے والے اجسام سے متعلق قوانین دریافت کر لیے تھے۔ مزید یہ کہ انہوں نے کشش ثقل کی اصلیت کے بارے میں غیر مبہم نظریات بھی وضع کر لیے تھے۔ وہ میکانکی طاقتوں کے نظریے سے بھی آگاہ تھے۔ طبیعیات کی شاخ ماسکونیات میں انہوں نے پہلی مرتبہ اجسام کی کثافت اضافی کے جداول مرتب کیے۔ انہوں نے پانی میں اجسام کے تیرنے اور ڈوبنے کے حوالے سے بھی بہت سے رسالے لکھے۔ بصریات میں انہوں نے یونانیوں کی اس غلط فہمی کو درست کیا کہ روشنی کی شعاع جسم میں سے گزر کر آنکھ تک پہنچتی ہے۔ انہوں نے روشنی کے انعطاف اور انعکاس کے مظاہر کو بھی سمجھ لیا تھا۔ اس دور کے مشہور ماہر بصریات ابن الہیثم نے یہ عظیم الشان دریافت کی کہ روشنی کی شعاع فضاء میں سے خم دار راستے پر سفر کرتی ہے۔ اس نے ثابت کیا کہ اسی مظہر کی بدولت ہم چاند اور سورج کو ان کے طلوع ہونے سے کچھ دیر پہلے اور غروب ہونے کے کچھ دیر بعد تک دیکھتے ہیں۔ بعض

نظریات کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ جدید دور کی پیداوار ہیں جیسے نظریہ ٔارتقاء کے بارے میں عام لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ انیسویں اور بیسویں صدی میں پروان چڑھا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ارتقاء اور نشوونما کے نظریات مسلم دور کی جامعات میں نہ صرف پڑھائے جاتے تھے بلکہ وہ ان نظریات کو آج کی نسبت زیادہ وسعت نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کو غیر نامیاتی اور معدنی اشیاء تک پھیلاتے تھے''۔ (5)

رابرٹ بریفولٹ (Robert Briffault) نہ صرف مسلمانوں کے سائنسی طرز فکر کی تعریف کرتا ہے بلکہ اسے ہی سائنس وٹیکنالوجی میں مغرب کی خیرہ کن ترقی کا حقیقی سبب گردانتے ہوئے کہتا ہے ''اگرچہ یورپ کی ترقی کا کوئی پہلو ایسا نہیں جس میں اسلامی تہذیب کے فیصلہ کن اثر کے نشانات موجود نہ ہوں، لیکن یہ اثر کہیں بھی اتنا واضح اور اہم نہیں جتنا کہ اس طاقت کے ظہور میں ہے جو دنیائے جدید کی مخصوص اور مستقل قوت اور اس کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے یعنی سائنس اور سائنسی طرز فکر۔''

پھر وہ سائنس وٹیکنالوجی میں مسلمانوں کی پیش رفت کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے ''دنیائے حاضر پر اسلامی علوم وفنون کا بڑا احسان ہے۔ عربوں نے علم کے ان تمام سرچشموں سے جو دستیاب ہو سکتے تھے، اپنا علم حاصل کیا۔ انہوں نے قدیم علوم میں تحقیق کی نئی روح پیدا کی۔ ریاضیات کو ترقی دی اور تجربے، مشاہدے اور پیمائش کے اسلوب اختیار کیے۔ عربوں نے یونانیوں کے علمی نظریات پر تنقید بھی کی اور ان پر اضافہ بھی کیا۔ انہوں نے بطلیموس کے علم کائنات کو تو قبول کر لیا، لیکن اس کی فہرست نجوم یا ستاروں کی جدول یا اس کی پیمائشوں کو قبول نہیں کیا۔ انہوں نے خود ستاروں کی بے شمار نئی فہرستیں مرتب کیں، کسوف کے ترچھے پن اور استقبال اعتدالین کی صحیح اقدار معلوم کیں اور سمت الراس کی دو الگ الگ پیمائشوں سے کرۂ ارضی کی جسامت کو معین کیا۔ البیرونی نے معدنیاتی نمونے جمع کیے اور مختلف اشیاء کو الگ الگ تول کر اوزان مخصوصہ کے جو نقشے تیار کیے وہ اب تک صحیح ہیں۔ عربوں نے صفر کا استعمال رائج کر کے ترمیم اعداد کے نظام اعشاریہ کو مکمل کیا۔ انہوں نے الجبرا ایجاد کیا اور اسے چوتھے درجے کی تعدیلات کے حل تک پہنچا دیا۔ انہوں نے علم مثلث کا استعمال شروع کیا اور یونانیوں کے وتر (chord) کی جگہ جیب زاویہ اور مماس (tangentine) کو ترویج دی۔ البتانی نے سورج کے اوج مدار کی حرکت کا انکشاف کیا اور ابوالوفاء نے قمر کے ثانوی اختلافات کا پتا چلایا۔ ابن

الہیثم نے قوس قزح پر لکھا۔ اس طرح انہوں نے انسانی تحقیق وتجسس کی قوتوں میں ہزار گنا اضافہ کیا اور یورپ کی نشاۃ ثانیہ عربی علوم وفنون کے مطالعے ہی کے زیر اثر وجود میں آئی''۔ (6)

'تاریخ سائنس' کا مصنف جارج سارٹن کہتا ہے کہ: ''گیارہویں صدی عیسوی میں علم وحکمت کا حقیقی ارتقاء مسلمانوں کا رہین منت تھا۔ اس زمانے کی اچھوتی اور نادر خدمات کا تعلق ریاضی سے ہے اور اوّل سے آخر تک مسلمانوں ہی کی سعی وکاوش کا نتیجہ۔ عمر خیام ان کا سب سے زیادہ فطین اور بدیع الفکر نابغہ ہے جو اس عہد میں گزرا اور جس کی اہم تخلیقات کے لیے ہم ان کے ممنون ہیں۔ مسیحی ریاضی دانوں کی جدوجہد سے اگرچہ کاوش اور سرگرمی کا اظہار ہوا، بایں ہمہ ان کی سطح اس قدر پست تھی کہ اس سے اسلامی کوششوں کے انحطاط کی تلافی نہیں ہوئی۔ پھر اس انحطاط کے باوجود اس وقت کے بعض مسلمان علماء کے کارنامے بڑے شاندار اور معرکہ خیز ہیں''۔ (7)

غرض یہ کہ خود اہل مغرب تسلیم کرتے ہیں کہ ان کا سائنس وٹیکنالوجی میں ترقی کا سفر جن انجانی بلندیوں کی طرف تیزی سے بڑھتا چلا جارہا ہے اور جس نے ایک نئے اور مضبوط سائنسی کلچر کی بنا رکھ دی ہے اس کی بنیادوں کو مسلمان سائنسدانوں کی کاوشوں ہی نے اساسی پختگی عطا کی ہے۔

۵۔ لیکن علوم وفنون کی اس ترقی اور سائنس وٹیکنالوجی میں اس پیش رفت نے مسلمان معاشرے کے لیے کوئی اخلاقی اور نظریاتی مسائل کھڑے نہیں کیے اور نہ اس نے مسلم معاشرے میں کسی نظریاتی کشمکش کو جنم دیا کیونکہ سائنس وٹیکنالوجی کی یہ ترقی اس نظریۂ علم کی پیداوار تھی جو اسلامی ورلڈ ویو کی روشنی میں ابھرا تھا بلکہ سائنس وٹیکنالوجی کی اس ترقی نے مسلم معاشرے کی تہذیبی برتری اور تمدنی ترقی کو چار چاند لگا دیئے کیونکہ یہ اس کے مجموعی تہذیبی مزاج سے ہم آہنگ تھی نتیجتاً اس نے مسلم معاشرے کی ترقی اور اس کے تہذیبی ارتقاء میں مثبت اور تعمیری کردار ادا کیا اور اس کے حسن وجاذبیت میں اضافہ کیا۔ (8)

مبحث دوم: مغرب میں سائنس وٹیکنالوجی کی ترقی

۱۔ مغرب نے بلاشبہ اکثر علوم اور خصوصاً سائنس وٹیکنالوجی میں محیر العقول ترقی کی ہے اور یہ ترقی اس کی قوت (خصوصاً حربی قوت) اور دنیا پر اس کے سیاسی، معاشی اور تہذیبی غلبے کا ایک بنیادی اور اہم ذریعہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ یہ ٹیکنالوجی مذہبی اور

اخلاقی اقدار کی نفی کرتی ہے خصوصاً ان دینی اقدار کی جن کا علمبردار اسلام ہے (یہ بحث آگے آرہی ہے کہ مغربی سائنس و ٹیکنالوجی بلااقدار (value-neutral) نہیں ہے) بلکہ اگر ہم وسیع انسانی تناظر میں دیکھیں تو ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے انسان کے مسائل کے حل کرنے کی بجائے اس کے دکھوں اور تکلیفوں میں اضافہ ہی کیا ہے (گو اس نے بلاشبہ انسانوں کو بہت سی تمدنی سہولتیں بھی بہم پہنچائی ہیں)۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم ان وجوہ پر غور کریں جو مغربی تہذیب کے اس مظہر کی بنیاد ہیں، مناسب محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے مغربی تہذیب کی پیدا کردہ ٹیکنالوجی پر یہ جو اعتراض کیا ہے اس کی کچھ تفصیلات بیان کردیں تاکہ ہمارا مذکورہ دعوی محض نعرہ اور دعویٰ بلا دلیل بن کر نہ رہ جائے۔ ہم ان تفصیلات کا ذکر دو عنوانات کے تحت کریں گے ایک مغربی ٹیکنالوجی کے اسلامی اقدار کے خلاف ہونے کے حوالے سے اور دوسرے اس کے عمومی طور پر انسان کی فطرت اور اس کے تعمیری رجحانات اور اخلاقی مفادات کے خلاف ہونے کے حوالے سے۔

۲۔ مغربی ٹیکنالوجی اسلامی اقدار کے خلاف ہے

۔ جب ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر آیا تو اس نے مسلمانوں کے اندر موسیقی اور گانوں کا شوق ابھارا حالانکہ اسلام میں موسیقی منع ہے [(9)] اور گانے اکثر و پیشتر مخرب اخلاق مواد پر مشتمل ہوتے اور طبیعت کو اللہ کی اطاعت کی بجائے فساد کی طرف مائل کرتے ہیں۔

۔ ٹی وی کی ایجاد نے ریڈیو کے نقصانات کو دوچند کردیا۔ یہ عورت کو بناؤ سنگھار اور غیر ساتر لباس کے ساتھ پیش کرتا ہے جب کہ اسلام غیر محرم عورت کو ایک نظر دیکھنے سے بھی منع کرتا ہے۔ [(10)] اس سے وقت کا ضیاع ہوتا ہے۔ ٹی وی کے اکثر پروگرام خلاف اسلام اور غیر تعمیری ہوتے ہیں اور انہیں واضح طور پر **لھو و لعب** قرار دیا جا سکتا ہے۔ ٹی وی کا فحاشی اور عریانی پھیلانا ایک ناقابل تردید حقیقت ہے جس سے حیا و عفت جیسی اسلامی اقدار کا خاتمہ ہوتا ہے۔ [(11)]

۔ ٹی وی اور سینما کے پروگراموں کا ایک ناگزیر جزو اداکاری ہے جس سے اسلام منع کرتا ہے۔ پھر مغرب نے ناچنے گانے والوں کو 'سٹار' اور 'آرٹسٹ' بنا کر اور معاشرے میں معزز اور اہم بنا کر پیش کیا تاکہ عام لوگ ان کی پیروی کریں جب کہ اسلامی معاشرے میں اس کے برعکس عزت کا معیار تقویٰ اور علم ہے نہ کہ گانا بجانا۔ [(12)]

۔ انٹرنیٹ کی سہولت نے فحش، لچر اور بے ہودہ پروگراموں کو ہر شخص کو گھر بیٹھے اس کی دسترس میں دے

دیا اور ایک مسلمان طالب علم یا نوجوان بڑی آسانی سے ان بیہودہ پروگراموں کو دیکھتا اور ان سے متاثر ہوتا ہے جب کہ والدین کو خبر بھی نہیں ہوتی اور نہ وہ اس پر چیک رکھ سکتے ہیں کیونکہ وہ رات کو اکیلا اپنے کمرے میں بیٹھا کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے ذریعے گندے پروگرام دیکھ سکتا ہے اور گھر میں کمپیوٹر نہ ہو تو ہر گلی محلے میں نیٹ کیفے کھلے ہوئے ہیں جہاں وہ معمولی کرایہ دے کر کمپیوٹر استعمال کر سکتا ہے۔

۔ رہی سہی کسر موبائل فون نے نکال دی ہے جو محض فون نہیں بلکہ اس میں کیمرہ بھی ہے، ٹیپ ریکارڈر بھی ہے اور ایک نوجوان مسلمان لڑکی یا لڑکا جس سے چاہے اور جب چاہے رابطے میں رہ سکتا ہے اور مغربی فون کمپنیوں نے پاکستان میں نوجوانوں کے اخلاق بگاڑنے کے لیے انہیں رات کے وقت گھنٹوں گپ شپ کے مواقع برائے نام چارجز پر مہیا کر دیئے ہیں ۔حج کے دوران کعبہ کا طواف کرتے ہوئے بھی لوگوں کے موبائل فونوں کی گھنٹیاں بجتی رہتی ہیں اور فلمی دھنوں کی موسیقی طواف کرنے والوں کو جبراً سننا پڑتی ہے اور ان کا حج خراب کرتی ہے۔

۔ ریڈیو، ٹی وی، ڈی وی ڈی ، انٹرنیٹ ،موبائل وغیرہ کے ذریعے جو فحاشی وعریانی پھیلتی ہے اور رابطے کی جو سہولت میسر آتی ہے اس کا لازمی نتیجہ رنگین مزاجی ، حیاوعفت کا خاتمہ، لھو ولعب، لذت پرستی اور فساد اخلاق ہے جس کی آخری صورت غیر قانونی جنسی تعلقات (زنا) پر منتج ہوتی ہے جو کبیرہ گناہ ہے، اسلامی معاشرت کا قاتل ہے اور سر تا پا فساد ہے اور اسی لیے اسلام نے اس کی سزا سو کوڑے یا رجم (پتھر مارنے سے موت) رکھی ہے۔[13] گویا یہ ٹیکنالوجی اور آلات مسلم معاشرے میں زنا جیسے کبیرہ گناہ اور شنیع فعل کو عام کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

۔ ریڈیو، ٹی وی اور تھیٹر نے عورت کا کردار منفی انداز میں بدلا ہے۔اس نے عورت کو ناچنے اور گانے والی ،دوسروں کا دل بہلانے والی، کسبی اور شمع محفل بنا دیا ہے جب کہ اسلام اسے گھر میں رہ کر بچوں کی تربیت کرنے والی ماں اور گھر کا نظام چلا کر خاوند کا بوجھ بٹانے اور سکھ دینے والی بیوی کا روپ دیتا ہے۔[14]

۔ ٹی وی نے مسلم معاشرت کی باہمی اخوت ومودت کی قدروں کو مجروح کیا ہے۔ پہلے مرد دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر شام میں کسی مشترک جگہ پر مل بیٹھتے تھے(گاؤں سے لے کر شہر تک ایسی جگہ ضرور ہوتی تھی جسے بیٹھک ، دارہ، دائرہ، چوپال۔۔۔وغیرہ کہتے تھے۔)۔اسی طرح عورتیں فارغ اوقات میں گلی محلے میں مل بیٹھتی تھیں۔ ان غیر رسمی مجلسوں میں مسائل زیر بحث آتے تھے اور ان کا حل سامنے آتا تھا۔حل نہ بھی نکلے تو کتھارسس اور مشاورت اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شرکت

اور سانجھ گیری کے فائدے مل جاتے تھے۔ اب لوگ کام کاج سے فارغ ہو کر گھر میں ٹی وی کے سامنے آبیٹھتے ہیں اور معاشرتی میل جول ختم ہو کر رہ گیا ہے۔

۔ بچے پہلے فارغ اوقات میں اپنی ماں یا دادی، نانی سے سبق آموز کہانیاں سنتے تھے جن سے اخلاقی وتہذیبی اقدار نئی نسل میں منتقل ہوتی تھیں۔ اس سے انسانی تعلقات میں گہرائی پیدا ہوتی تھی اور بچوں کی ماں باپ سے محبت بڑھتی تھی۔ لڑکے کھیتوں یا پارکوں میں جا کر کھیلتے تھے جس سے ان کا جسم مضبوط ہوتا تھا اور مشقت کی عادت پڑتی تھی۔ ٹیم ورک میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا، لیڈر کی اطاعت کرنا، باہمی ایڈجسٹمنٹ، جیتنے کی خوشی اور ہار سہارنے کا سلیقہ پیدا ہوتا تھا۔ لڑکیاں فارغ اوقات میں گھر داری سیکھتی تھیں۔ کھانا پکانا، سویٹر بننا، کپڑے سینا، کڑھائی کرنا۔۔۔۔ یہ سب لڑکیوں کے روزمرہ کے معمولات میں شامل ہوتا تھا اور ان کے مستقبل میں کام آتا تھا لیکن اب بچے ٹی وی اور کمپیوٹر کے سامنے سے ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتے اور مذکورہ سرگرمیاں ختم ہو کر رہ گئی ہیں۔ (15)

۔ اس ٹیکنالوجی کا ایک مظہر وہ اشیاء وآلات ہیں جو منع حمل کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ یورپ میں چونکہ عریانی و فحاشی عام ہے، باہم رضامندی سے زنا کی وہاں قانوناً اجازت ہے لہٰذا کنواری لڑکیوں کو خصوصاً ان آلات کی ضرورت پڑتی ہے اور یہ آلات ہر جگہ خصوصاً سکولوں، کالجوں میں، یہاں تک کہ ان کے باتھ روموں میں مہیا کیے جاتے ہیں تاکہ لڑکیاں کچی عمر میں حاملہ نہ ہو جائیں۔ امریکہ و یورپ یہ آلات مسلمان معاشروں میں بلا قیمت یا برائے نام قیمت پر بھجواتے ہیں بلکہ مسلم ممالک کو اس صنعت کی ٹیکنالوجی مہیا کرتے اور فیکٹریاں لگا کر دیتے ہیں اور اس مقصد سے مسلمان حکومتوں کو کثیر مقدار میں فنڈز مہیا کرتے ہیں اور ان سے وزارتیں اور محکمے بنواتے ہیں تاکہ یہ مانع حمل اشیاء مسلم نوجوانوں کو بسہولت ہر جگہ میسر آجائیں۔ اس کے لیے بظاہر یہ مقصد بیان کیا جاتا ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو پایا جائے لیکن ظاہر ہے کہ اس سے یہ خفیہ مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے کہ مسلمان نوجوانوں کے اخلاق تباہ ہوں اور انہیں بدکاری کی ترغیب ملے۔ بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو پانا خود ایک متنازعہ مسئلہ ہے کیونکہ بہت سے مسلمان دانشور یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے پاس وسائل کی کمی نہیں لہٰذا آبادی کم کرنے کی بجائے وسائل کے بہتر استعمال کی حکمت عملی پر عمل کرنا چاہیے۔ نیز وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یورپ و امریکہ کی اپنی آبادی چونکہ مسلسل کم ہو رہی ہے (ان کے غلط نظریات اور فرسودہ لائف سٹائل کی وجہ سے) اور مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور وہ امریکہ و

یورپ میں پھیل رہے ہیں لہٰذا ان کے نزدیک یہ بھی اہل مغرب کی سازش ہے کہ مسلمانوں کو ان کی آبادی کم کرنے کی ترغیب دی جائے۔ (16)

۔ اور اب امریکہ و یورپ نے باڈی سکیننگ کا نظام وضع کر کے مسلمانوں کو مشکل میں ڈال دیا ہے اور اگر یہ سہولت عام ہوگئی تو جو طوفان بدتمیزی بلکہ طوفان بے شرمی و بے حیائی برپا ہوگا اس کا محض تصور ہی دل دہلا دینے والا ہے اور ظاہر ہے اس سے اسلامی تعلیمات و اقدار کی نفی ہوگی بلکہ یہ کشمکش شروع بھی ہوگئی ہے اور یورپ و امریکہ میں کئی مسلمان مردوں اور عورتوں نے ان سکینرز سے گزرنے سے انکار کر دیا ہے اور جرمانہ ادا کرنا اور سفر نہ کرنا قبول کر لیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے یہ مسئلے کا کوئی حل نہیں۔

مغربی سائنس وٹیکنالوجی غیر تعمیری اور انسانی فطرت کے خلاف ہے

مغرب نے سائنس وٹیکنالوجی میں جو ترقی کی ہے بلاشبہ اس نے انسان کو بہت سی سہولتیں بھی بہم پہنچائی ہیں مثلاً انسانی ضروریات کی اشیاء کی وسیع پیداواری صلاحیت (مشینری کا استعمال اور انڈسٹریلائزیشن)، نقل وحمل کے تیز ترین اور آرام دہ ذرائع (کاریں، بسیں، ریل اور ہوائی جہاز)، معلومات کی فراوانی اور فراہمی میں تیزی اور سہولت (ریڈیو، ٹی وی اور انٹرنیٹ)، موسموں کی شدت سے بچانا (پنکھے، ائیرکنڈیشنر، ہیٹرز): سماجی زندگی کی سہولتیں جیسے ہر گھر میں پانی، روشنی (بجلی) اور ایندھن (سوئی گیس اور تیل کے چولھے) کی فراہمی اور اخراج فضلہ (سینی ٹیشن) کی سہولت ۔۔ وغیرہ ۔ یہ ساری سہولتیں اور آسانیاں بجا اور قابل تعریف لیکن خالص انسانی نقطۂ نظر سے سوچیے تو اس کے منفی پہلو بھی بہت سے ہیں جنہوں نے انسانی زندگی کو مصیبت اور آزار سے دوچار کر رکھا ہے مثلاً:

۱۔ مشینوں کے وسیع استعمال نے ہیوی انڈسٹری کو وجود بخشا اور وسیع پیداواری نے انڈسٹریلائزیشن کو جنم دیا لیکن اس سے انسانی دست کاری اور صنعت وحرفت، کاٹیج انڈسٹری اور چھوٹی صنعتیں دم توڑ گئیں جن سے لاکھوں کروڑوں انسان بے روزگار ہوگئے اور ان کے لیے معاشی، سماجی اور نفسیاتی مسائل پیدا ہوگئے۔ (17)

۲۔ سہولتوں کی کثرت نے انسان کو جسمانی مشقت ومحنت سے دور کر دیا ہے اور اس کی غذائی عادات بگڑ گئی ہیں جن سے انسانی صحت پر برے اثرات پڑے ہیں، بیماریوں کی کثرت ہوگئی ہے اور انسانی اوسط عمر بھی کم ہوگئی ہے۔

۳۔ انڈسٹریلائزیشن نے انسانی ماحول کو آلودگی (environment polution) سے بھر دیا ہے جو اس وقت انسانیت کا بہت بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس نے پانی اور ہوا تک کو آلودہ کر دیا ہے جس کے نہ صرف انسانی صحت پر بہت بُرے اثرات پڑ رہے ہیں بلکہ یہ خطرہ دن بدن مہیب ہوتا جا رہا ہے کیونکہ اس نے اوزون گیس کے اس فضائی حصار کو بھی توڑ نا شروع کر دیا ہے جو اہل زمین کو 'آسمانی بلاؤں' سے محفوظ رکھنے کے لیے خالق کائنات نے فراہم کیا تھا۔ اس سے زمین کے موسم بگڑنا شروع ہو گئے ہیں، کرۂ ارض پر درجہ حرارت بڑھ رہا ہے اور گلیشیئر پگھلنا شروع ہو گئے ہیں اور بعید نہیں کہ کسی وقت اوزون گیس کا یہ حصار پھٹ جائے اور قیامت آجائے۔ (18)

۔ سائنس و ٹیکنالوجی میں پیش رفت سے دنیا کے قوی ممالک نے انتہائی تباہ کن ہتھیار بنا لیے ہیں۔ جاپان پر ایک ایٹمی حملے نے لاکھوں انسانوں کو ختم کر دیا بلکہ ہر قسم کے جانداروں اور نباتات کو بھی نیست و نابود کر دیا اور زندگی کو جہنم بنا دیا۔ اب تو اس سے بھی زیادہ تباہ کن کیمیائی اور نیوکلیئر ہتھیار وجود میں آ گئے ہیں اور اگر خدانخواستہ زمین پر نیوکلیئر جنگ چھڑ گئی (یاد رہے کہ بڑی اور طاقتور قوموں کے چھوٹے ممالک اور اقوام پر حملے اور ظلم و ستم بھی جاری ہیں) تو پورا کرۂ ارض تباہ و برباد ہو جائے گا۔ (19)

۔ بلا شبہ جدید سائنس و ٹیکنالوجی نے انسان کو سہولتیں مہیا کی ہیں لیکن یہ بھی تصور کیجیے کہ یہ ٹیکنالوجی کیا قیمت انسانوں سے وصول کر رہی ہے مثلاً یہی دیکھئے کہ بجلی اور مشینوں کے استعمال سے خصوصاً بسوں، ٹرکوں، کاروں، ریلوں اور ہوائی جہاز کے حادثوں میں کتنے لاکھ انسان سالانہ مرتے اور زخمی ہوتے ہیں۔

۔ مغربی سائنس و ٹیکنالوجی نے جس طرز زندگی اور طرز فکر کو جنم دیا ہے اس نے انسان کو یا تو مشین بنا دیا ہے یا حیوان — انسان بہر حال نہیں رہنے دیا۔ نتیجتاً اس غیر فطری زندگی نے انسان کو خوشی اور اطمینان سے محروم کر دیا ہے اور اس کی زندگی کو تنہائی اور دکھوں سے بھر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا سے زیادہ سرمایہ اور ساری دنیا سے زیادہ سائنس و ٹیکنالوجی کی سہولتیں امریکہ و یورپ میں ہیں لیکن دنیا بھر میں سب سے زیادہ تنہائی، ذہنی بیماری اور بے مقصدیت وہیں ہے۔ سب سے زیادہ نفسیاتی ہسپتال اور پاگل خانے بھی وہیں ہیں، سب سے زیادہ خودکشیاں بھی وہیں ہوتی ہیں، سب سے زیادہ اولڈ ہوم بھی وہیں ہیں اور سب سے زیادہ جرائم بھی وہیں ہوتے ہیں۔ (20)

ان ساری خرابیوں اور بُرے نتائج سے صرفِ نظر اور درگزر کرنا اور جدید سائنس وٹیکنالوجی کے گن گاتے چلے جانا نہ معلوم عقل و دانش کی کون سی قسم ہے؟

مغربی ٹیکنالوجی میں خرابی کا سبب

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد کہ مغربی سائنس وٹیکنالوجی نے انسانوں کو بعض سہولتیں بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ نہ صرف ان کے دکھوں اور تکلیفوں میں اضافہ کیا ہے بلکہ وہ اسلامی تعلیمات و اقدار کی نفی بھی کرتی ہے آیئے اب اس سوال پر غور کریں کہ ایسا کیوں ہے کہ مغربی ٹیکنالوجی کا مزاج و کردار بحیثیت مجموعی انسانی فطرت اور اسلام کے خلاف ہے؟ اس کا سادہ، واضح اور شافی جواب یہ ہے کہ مغربی ٹیکنالوجی اس لیے غیر اسلامی، غیر انسانی اور غیر فطری ہے کہ وہ ایسے نظریۂ علم کی پیداوار ہے جو غلط ہے اور مغربی نظریۂ علم اس لیے غلط ہے کہ وہ غلط نظریۂ حیات اور غلط ورلڈ ویو کی پیداوار ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالکل منطقی اور طبعی ہے، یہ کوئی حادثہ نہیں بلکہ غلط ورلڈ ویو کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔ مغربی تہذیب جس غلط فکر پر مبنی ہے اس کا لازمی نتیجہ فساد فی الارض ہی ہونا تھا جس کے آخری نتیجے کے طور پر یہ تہذیب تباہ ہو کر رہے گی۔

غلط نظریۂ علم کے اثرات

نظریۂ علم اگرچہ فلسفے کا ایک دقیق مبحث ہے لیکن ایک عام قاری، جو فلسفہ اور خصوصاً فلسفۂ علم کا سنجیدہ طالب علم نہ ہو، اس کے لیے بھی یہ جاننا اور سمجھنا ضروری ہے کہ نظریۂ علم کے اثرات علم اور علوم وفنون کے ڈھانچے پر کیوں کر پڑتے ہیں؟ نظریۂ علم جن سوالات سے بحث کرتا ہے وہ یہ ہیں کہ علم کا منبع و مصدر کیا ہے؟ علم کا موضوع و مقصد کیا ہے؟ علم کی اقسام کیا ہیں؟ کون سا علم مفید اور اچھا ہے اور کون سا علم بُرا ہے؟ کون سا علم حاصل کرنا چاہیے اور کون سا چھوڑ دینا چاہیے؟ وغیرہ۔ مغربی نظریۂ علم ان سوالات کے جو جوابات دیتا ہے وہ مختصراً یہ ہیں کہ علم کا منبع خود انسان کی ذات ہے، اس کی عقل اور اس کا مشاہدہ وتجربہ ہے۔ حقائق صرف وہ ہیں جو حواس خمسہ کے ذریعے ہمیں معلوم ہوتے ہیں اور حتمی اور حقیقی علم صرف ان معلومات کا نام ہے جو ہمیں آنکھوں سے دیکھنے، کانوں سے سننے، ہاتھوں سے چھونے، ناک سے سونگھنے اور زبان سے چکھنے سے حاصل ہوتی ہیں۔ کیونکہ یہ وہ معلومات اور حقائق ہیں جو قابل تصدیق (verifiable) ہیں جن کی ہم تجربہ گاہ میں توثیق کر سکتے ہیں اور اپنے

تجربات سے ان کا صحیح ہونا ثابت کر سکتے ہیں۔ (21) جہاں تک ان نظریات کا تعلق ہے جو فلسفی عقل محض سے قائم کرتے ہیں اور انسان اور انسانی زندگی سے متعلق ان عقائد و نظریات کا تعلق ہے جنہیں اہل مذہب یہ کہہ کر پیش کرتے ہیں کہ یہ انہیں (پیغمبروں کی وساطت سے، فرشتے کے ذریعے) کسی بالا تر ہستی (اللہ/ خدا/ God) سے ملتے ہیں تو مغربی نظریۂ علم کی رو سے یہ 'علم' نہیں ہیں، یہ 'حقائق' نہیں ہیں کیونکہ حواس خمسہ سے حاصل ہونے والی معلومات ان کی تصدیق نہیں کرتیں اور نہ کسی معمل کے تجربے سے ان کی حقانیت ثابت کی جا سکتی ہے۔ (22)

بایں صورت یہ نظریۂ علم چونکہ وحی کا انکار کرتا ہے اور اس کی بالا دستی کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ اصلاً اسے ذریعۂ علم اور مصدر علم ہی نہیں مانتا لہٰذا اس کا غیر اسلامی ہونا یا اسے اسلامی حوالے سے غلط کہنا بالکل واضح ہے۔ اسے ہم غیر فطری اور خلاف فطرت انسان بھی کہہ سکتے ہیں کیوں کہ یہ نظریۂ علم نفس انسانی اور اس کی ضروریات اور تقاضوں کی ایک ناقص اور یک رخی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ انسان کی صرف مادی، دنیاوی اور محض جسمانی ضروریات کا ادراک کر سکتا ہے لہٰذا یہ انسان کو محض ایک حیوان سمجھتا ہے۔ یہ نہ صرف مذہب اور مابعد الطبیعیات کا انکار کرتا ہے بلکہ مستقل اخلاقی قدروں کو بھی نہیں مانتا اور صرف ان تغیر پذیر اخلاقی قدروں کا اقرار کرتا ہے جو انسانی معاشرت اور کاروبار کی دنیاوی ضرورت ہوں۔ (23) یوں یہ نظریۂ علم انسان کے اخلاقی وجود اور اس کی روحانی ضروریات کا انکار کرنے کی وجہ سے نفس انسانی اور اس کی ضروریات اور تقاضوں کا ایک ناقص اور محرف (distorted) تصور پیش کرتا ہے اور نفس انسانی کا مطالعہ ایک کُل کی بجائے محض جزوی طور پر کرتا ہے۔ ظاہر ہے یہ فطرت انسانی کی ادھوری نقشہ کشی ہے جو اس کے سارے پہلوؤں کا احاطہ نہیں کرتی۔ اسی تناظر میں ہم اسے غیر عقلی (Irrational)، غیر منطقی، غیر فطری اور غلط قرار دینے پر مجبور ہیں۔

مغربی نظریۂ علم بلا اقدار (Value-Neutral) نہیں

مندرجہ بالا وضاحت سے یہ بھی مبرہن ہو گیا کہ مغربی نظریۂ علم بلا اقدار اور ویلیو نیوٹرل نہیں بلکہ یہ مذہب اور مستقل اخلاقی اقدار کی نفی اور تغلیط کرتا ہے اور دنیاوی معاشرت اور بزنس وغیرہ کے لیے تغیر پذیر اقدار کا قائل بلکہ بعض مخصوص طرز کی اقدار کو پروموٹ کرتا ہے۔ جس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہب کا انکار بھی ایک مذہب ہے، اسی طرح مذہب کی طے کردہ مستقل اخلاقی اقدار کی نفی کرنے

والے اور بعض طرح کی اقدار کی افزائش کرنے والے کسی نظریے کو natural value نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ نظریہ نہ صرف مذہب کی طے کردہ مستقل اخلاقی اقدار کی نفی کرتا ہے بلکہ ان کے بالمقابل بعض تغیر پذیر دنیاوی اخلاقی اقدار کا اثبات بھی کرتا ہے۔ (24)

اور جس طرح یہ کہنا غلط ہے کہ مغربی نظریۂ علم ویلیو نیوٹرل ہے اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اس نظریۂ علم کی پیدا کردہ ٹیکنالوجی ویلیو نیوٹرل ہوتی ہے بلکہ یہ ٹیکنالوجی بھی مخصوص اقدار کو پروموٹ کرتی ہے گو یہ ایسا خاموشی سے اور بالواسطہ طور پر کرتی ہے، نعرے، ادعا اور نظریہ سازی سے نہیں کیونکہ اقدار کی یہ تبدیلی اس ٹیکنالوجی کے استعمال کا عملی نتیجہ ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا محض سادہ لوحی ہے کہ ٹی وی اور کمپیوٹر محض بے جان آلے ہیں اور ان کو اچھے مقاصد کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اور بُرے مقاصد کے لیے بھی اور یہ کہ ان آلات کے اچھا یا بُرا ہونے کے بارے میں کوئی شرعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ نہیں! بلکہ جس طرح ہم نے اوپر کہا کہ مغربی نظریۂ علم ویلیو نیوٹرل نہیں ہے کیونکہ وہ مذہب کی طے کردہ مستقل اخلاقی اقدار کی نفی کرتا ہے اور ایک خاص نوع کی محض دنیاوی اور غیر مستقل اخلاقی اقدار کا اثبات کرتا ہے اسی طرح یہ بھی حتماً کہا جا سکتا ہے کہ مغربی ٹیکنالوجی بھی ویلیو نیوٹرل نہیں ہے بلکہ یہ مغرب کے اس ملحدانہ فکر وتہذیب کے نظام اقدار کو سپورٹ اور پروموٹ کرتی ہے جس کی وہ پیداوار ہے اور مذہبی اور روحانی یعنی اسلامی اخلاقی اقدار کی نفی کرتی ہے۔

پس واضح ہوگیا کہ مغربی ٹیکنالوجی ویلیو نیوٹرل نہیں ہے بلکہ وہ اسلامی اقدار کی نفی کرتی ہے اور غیر اسلامی اقدار کو پروان چڑھاتی ہے کیونکہ وہ اس نظریۂ علم کی پیداوار ہے جو ویلیو نیوٹرل نہیں ہے بلکہ وہ مذہبی، روحانی اور اخلاقی اقدار خصوصاً اسلامی اقدار کی نفی کرتا اور غیر فطری اور غیر اسلامی اقدار کو پروان چڑھاتا ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب ملنا اب بھی باقی ہے کہ مغربی نظریۂ علم ویلیو نیوٹرل کیوں نہیں ہے اور وہ غیر اسلامی اور غیر فطری کیوں ہے؟

مغربی نظریۂ علم مغرب کے ملحدانہ ورلڈ ویو کی پیداوار ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ مغربی نظریۂ علم ایک ایسے ورلڈ ویو کی پیداوار ہے —اور ہر تہذیب کا نظریۂ علم اس کے ورلڈ ویو ہی کی پیداوار ہوتا ہے— جو اپنی کنہ میں مذہب دشمن اور غیر اسلامی ہے اور یوں وہ غیر فطری بھی ہے اور اس کے پیدا کردہ علوم اور ٹیکنالوجی ویلیو نیوٹرل بھی نہیں بلکہ وہ واضح طور پر مذہبی اور اخلاقی اقدار کی نفی کرتے ہیں۔ ممکن ہے ایک عام قاری کو یہ محض دعویٰ لگے لہٰذا اس کی

تفصیلی وضاحت ضروری ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ مغربی تہذیب کی فکری بنیادوں میں عیسائیت کا کردار برائے نام ہے۔ اس کی بالکل نفی تو نہیں کی جا سکتی تاہم یہ کردار اس کی بُنت (construction) میں غالب بہر حال نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس کے تشکیلی اجزاء میں سے ایک ہے اور جو رنگ اس تہذیب پر غالب ہے وہ ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم، لبرلزم وغیرہ کا ہے جنہوں نے اس کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔(25)

ہیومنزم جس کی ابتداء سولہویں صدی میں تحریک احیاء یورپ (Renaissance) کے دوران ہوئی، ابتداءً قدیم یونانی فکر و تہذیب کے احیاء اور انسانی تکریم کے تصورات پر مبنی تھا لیکن ازاں بعد مغربی فکر میں اس کا ارتقاء سائنٹفک ہیومنزم کی صورت میں ہوا جس کے علمبردار ہائیڈیگر اور سارتر ہیں جنہوں نے انسان کو خود مختار بلکہ مختار مطلق قرار دے دیا جو مذہب کی غلامی سے آزاد ہے اور اپنا خدا خود ہے۔(26) رینے سانس کے نتیجے میں **اصلاح مذہب کی تحریک** (Reformation) ابھری جس نے نہ صرف محرف عیسائیت کے من گھڑت، غیر فطری اور غیر سائنسی افکار و تصورات کی مذمت کی اور معاشرے کو مذہب کی تکریم اور اس پر عمل سے دور کر دیا بلکہ آزاد خیال حلقوں میں مذہب سے نفرت اور اس سے دشمنی کے بیج بھی بو دیئے۔(27) ایک عیسائی معاشرے میں ہیومنزم کی فکر نے جو تضادات ابھارے، ان سے ہم آہنگی کے لیے **سیکولرزم** کا نظریہ ابھرا جس نے یہ قرار دیا کہ مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے جس کا اجتماعی زندگی میں کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیے۔ مطلب یہ کہ جس کسی نے مذہب اور خدا کو ماننا ہے وہ اپنی ذاتی زندگی میں مان لے لیکن سول سوسائٹی اور ریاست کے اجتماعی معاملات (جیسے سیاسی، معاشی، معاشرتی، قانونی، تعلیمی نظام۔۔۔وغیرہ) سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔(28) یوں سیکولرزم نے مذہب اور خدا کے اقتدار کو بہت محدود کر دیا اور اسے تقریباً بے اثر کر دیا اور معاشرے کو مذہبی تعلیمات و اقدار کی پابندیوں سے آزاد کر کے اسے خود مختاری و آزادی بخش دی۔

کیپٹل ازم یعنی سرمایہ دارانہ نظام نے بھی مغربی معاشرے میں مذہبی اقدار کی بیخ کنی میں اہم کردار ادا کیا کیونکہ اس نے مادی اور دینوی فلاح و ترقی کو اساس قرار دیتے ہوئے انسان کی ساری کوششوں کا مرکز و محور دنیا میں کامیابی، دنیاوی آسائشوں کے حصول اور بہتر معیار زندگی کے لیے مسابقت کو قرار دیا(29) اور دنیا کی محبت اور مال کی محبت کو اساسی قرار دے کر آخرت کے تصور کو پس

پشت ڈال دیا جو مذہبی فکر میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا۔

مذہب کی اساس خدا اور آخرت کے ساتھ 'وحی' اور 'کتاب' پر ہے یعنی وہ بالاتر ہستی جسے ہم اللہ/خدا/God کہتے ہیں وہ زندگی گزارنے کے لیے انسان کو جو ہدایت دیتی ہے وہ اسے ایک کتاب کی صورت میں نازل کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ ہدایت بصورت کتاب ہمیں وہ دانش اور علم مہیا کرتی ہے جو صحیح، محکم اور حتمی ہوتا ہے۔ سیکولرزم نے خدا اور مذہب کے کردار کو محدود کر کے اور ہیومنزم نے خود انسان کو خدا بنا کر خدائی علم کی برتری کے تصور کو بھی ختم کر دیا اور یہ قرار دیا کہ حقیقی اور حتمی علم صرف وہ ہے جو انسان اپنی عقل یا اپنے حواس سے حاصل کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے یہ علم اللہ، اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور وحی کی تائید نہیں کرتا جو علم کے مابعد الطبیعی ذرائع ہیں جن کی اساس مذہب پر ہے۔

ہیومنزم، سیکولرزم، کیپٹل ازم، لبرلزم، سائنٹسزم اور برائے نام عیسائیت پر مبنی اس تہذیب کے ورلڈ ویو کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان مکمل آزاد و خود مختار بلکہ مختار مطلق ہے۔ کوئی ایسا بالا دست اور ساری ممکنہ ارفع خصوصیات اور قوتوں کا حامل اللہ/خدا/God نہیں ہے جس کی اطاعت و عبادت انسانوں پر لازم ہو اور یہ کہ ہماری ساری کوششوں اور تمناؤں کا محور دنیا کی یہ زندگی ہے نہ کہ آخرت۔ اور یہ کہ حتمی علم وہ نہیں ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے بلکہ وہ ہے جو انسان کو اس کے حواس سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ مغربی ورلڈ ویو ظاہر ہے کہ مذہب مخالف ایجنڈے پر مشتمل ہے اور یہ مذہب کے بنیادی کردار، تعلیمات اور اقدار کی نفی کرتا ہے لہٰذا یہ ہرگز ویلیو نیوٹرل نہیں ہے۔ اس کا غیر اسلامی ہونا بھی واضح ہے کیونکہ اسلامی ورلڈ ویو نمایاں طور پر مغربی ورلڈ ویو کے متضاد ہے جو کہتا ہے کہ انسان اللہ کا عبد ہے اور اللہ وہ بالادست و بالاتر ہستی ہے جو انسان کی خالق، مالک، ہادی، رازق، اس کی زندگی اور موت اور اس کے نفع و نقصان پر قادر ہے اور یہ کہ بنیادی اہمیت آخرت کی زندگی کو حاصل ہے جہاں دنیاوی زندگی میں انسان کے اختیار کردہ طرز عمل کا نتیجہ نکلے گا اور اس الہ کی ہدایت منبع علم و دانش ہے۔ ظاہر ہے یہ ساری باتیں مغربی ورلڈ اور اس کے نظریۂ علم کے برعکس ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اوّل الذکر ورلڈ ویو اور نظریۂ علم کے پیدا کردہ علوم و فنون اور ٹیکنالوجی ہرگز اسلامی ورلڈ ویو، اس کے نظریۂ علم اور اس کے علوم و فنون کے مطابق نہیں ہو سکتے۔

اندریں حالات مغربی علوم اور ٹیکنالوجی کا خلاف مذہب و اخلاق ہونا اور خلاف فطرت انسانی اور

خلاف اسلام ہونا ظاہر و باہر ہے کیونکہ وہ انہی خصائص کے حامل نظریۂ علم کی پیداوار ہیں اور یہ نظریۂ علم بھی ایسے ورلڈ ویو کا نتیجہ ہے جو انہی خصوصیات کا حامل ہے۔

مبحث سوم: مغرب میں جدید ٹیکنالوجی کے خلاف ردعمل — پوسٹ ماڈرنزم

اس سائنس و ٹیکنالوجی کے انسانی فطرت کے خلاف ہونے اور اس کے غیر تعمیری بلکہ تخریبی اور نقصان دہ ہونے کے خلاف خود مغرب میں ردعمل ہوا ہے اور وہاں کے فلاسفر، دانشور اور جہاں دیدہ طبقہ اس کی مخالفت کر رہا ہے اور فلاسفی آف ٹیکنالوجی مغرب میں فلسفے کا ایک باقاعدہ دبستان بن چکا ہے[30]۔ جدید ٹیکنالوجی پر تنقید کرنے والوں کا کہنا ہے کہ یہ ٹیکنالوجی غریب قوموں پر غلبے، کنٹرول اور استحصال کا ذریعہ بن چکی ہے اور اس نے انسانیت کا وجود خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اس موضوع پر لکھنے والوں میں جیکوئس ایلول (Jacques Ellul) آئیوان ایلچ (Ivan Illich) لانگڈن وِنر (Langdon Winner) جوزف ویزن بام (Josseph Weizenbaum) تھیوڈور روزاک (Theodore Roszak) نیل پوسٹ مین (Neil Postman) اور لوئس مامفورڈ (Lewis Mumford) شامل ہیں۔

امریکہ میں بیسویں صدی میں ستر کی دہائی میں ٹیکنالوجی پر تنقید کے مسئلے نے ایک سیاسی موضوع کی حیثیت اختیار کر لی جو (Anarcho-primitivism) کہلاتا ہے۔ اس کے علمبرداروں میں بعض سابق کمیونسٹ دانشور جیسے فریڈی پرل مین (Fredy Perl Man) جان زرزان (John Zerzan) اور ڈیوڈ واٹس (David Watson) سرفہرست ہیں جن کا کہنا ہے کہ عصر حاضر کی اکثر معاشرتی الجھنوں اور بیماریوں کی تہہ میں صرف سرمایہ دارانہ نظام ہی نہیں بلکہ موجودہ انڈسٹریل سوسائٹی اور جدید ٹیکنالوجی کارفرما ہے۔ اس نقطۂ نظر کو عام کرنے میں جریدہ '*Fifth Estate*' فرینکفرٹ سکول اور Situationist انٹرنیشنل وغیرہ نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔[31]

مغربی مفکر اور دانشور جدید ٹیکنالوجی کی مذمت کن وجوہ کی بناء پر کرتے ہیں، اس کا اندازہ کرنے کے لیے پروفیسر ڈاکٹر سائمن رامو (امریکی بیلسٹک میزائل پروگرام کے چیف سائنٹسٹ اور امریکی صدر سے اعلیٰ ترین سول ایوارڈ حاصل کرنے والے یونیورسٹی پروفیسر) کی کتاب سے چند اقتباسات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں:[32]

''آج ہمارے بہت سے دانشور یہ سوچتے ہیں کہ جدید ٹیکنالوجی ناکام ہوچکی ہے اور ہماری بہت سی معاشرتی بیماریوں کا سبب بھی یہی ہے۔آج جدید معاشرے کی حالت اطمینان بخش نہیں جیسی کہ ہم توقع کرتے تھے اور نہ یہ سابقہ معاشروں سے بہتر ہے۔آج جب ہم اسّی کی دہائی میں داخل ہورہے ہیں(اس کی کتاب 1983ء میں چھپی تھی) تو ہمارے صنعتی شہروں میں آبادی کے بڑھتے ہوئے اژدہام کے سبب وہاں آرام دہ گھروں کا تصور عنقا ہوگیا ہے۔کار رکھنا، جو آج کی زندگی میں بھاگ دوڑ کے لیے ناگزیر ہو چکا ہے اب باعث راحت نہیں باعث زحمت بن چکا ہے کیونکہ اب ہمارے دن کا اچھا خاصہ حصہ کاروں میں سفر کرتے اور دھکے کھاتے گزرتا ہے۔ پھر کاروں کی کثرت اور ان کے دھوئیں نے ہماری ہوا کو اتنا آلودہ کر دیا ہے کہ اس میں سانس لینا دوبھر ہو رہا ہے۔ پھر ان گاڑیوں کے حادثات میں جتنی جانیں ضائع ہوتی ہیں اور جتنے لوگ معذور ہوتے ہیں اتنے تو دشمنوں کے خلاف ہماری جنگوں میں بھی نہیں ہوئے ہوں گے۔ بلاشبہ کاروں کے ایسے جدید ماڈل بھی آگئے ہیں جو قدرے محفوظ ہیں اور کم کاربن استعمال کرتے ہیں لیکن ایسی کاریں اتنی مہنگی ہیں کہ عام آدمی کی قوت خرید سے باہر ہیں نتیجہ یہ کہ پرانی کاریں ہی استعمال ہورہی ہیں۔اس ٹیکنالوجی نے جس طرز معیشت کو جنم دیا ہے اس نے افراط زر، بڑھتی ہوئی شرح سود اور کثرت بیروزگاری کو جنم دیا ہے جس کے خاتمے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔''

''اس میں کوئی شک نہیں کہ جدید ٹیکنالوجی نے ہمیں سہولتیں بھی دی ہیں لیکن اس بات سے کیسے صَرف نظر کیا جائے کہ اس ٹیکنالوجی کا اکثر و بیشتر استعمال کینسر کی افزودگی کا باعث بن رہاہے۔ کھادیں، فصلوں کے لیے کیڑے مار دوائیاں اور خوراک محفوظ کرنے کے کیمیکلز (preservatives) ان سب کا غیر مؤثر استعمال کینسر جیسے موذی مرض کا سبب بنتا ہے اور مزید ستم یہ کہ سائنس اپنی تمام تر تحقیق وترقی کے باوجود آج تک اس موذی مرض کا علاج دریافت نہیں کرسکی[(33)] جس سے سائنس کی محدود افادیت مبرہن ہوجاتی ہے کہ جدید ٹیکنالوجی معاشرے کی ہر مشکل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔''

''ڈی این اے کی دریافت نے اگرچہ کئی بیماریوں کے علاج میں سہولت پیدا کی ہے لیکن اس نے کیمیائی جنگ کے امکانات بھی بڑھا دیئے ہیں۔اسی طرح کمپیوٹر نے اگرچہ آج کے پیچیدہ معاشرے کے لیے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے حوالے سے نئی سہولتوں کا انبار لگا دیا ہے لیکن کمپیوٹر ٹیکنالوجی کی ترقی اور انسانی زندگی میں اس کے بڑھتے ہوئے کردار نے انسانوں کو بھی کمپیوٹر بنا دیا ہے اور انڈسٹری میں کمپیوٹر

کا استعمال اتنا بڑھتا جا رہا ہے کہ وہاں اب انسانوں کی ضرورت دن بدن کم ہوتی جا رہی ہے۔"

"ہماری جدید ٹیکنالوجیکل سوسائٹی نے بیروزگاری کو عام کیا ہے اور پیداوار بھی اتنی نہیں بڑھائی کہ افراط زر ہی کم ہو جاتا۔ اسی طرح ہم سستی انرجی کی دریافت میں بھی ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ ضروریات زندگی کی جتنی مقدار میں انسانوں کو ضرورت ہے اس کے متبادلات بھی ہم فراہم نہیں کر سکے۔ شعبۂ طب میں تحقیق و ترقی اگرچہ تیز رفتاری سے جاری ہے لیکن علاج معالجے کی سہولتیں اب بھی ناکافی اور اتنی مہنگی ہیں کہ یہ ہر آدمی کی دسترس میں نہیں۔ اسی طرح اگرچہ مانع حمل ادویات نے ہمیں فیملی پلاننگ میں مدد دی ہے لیکن اس نے ہماری نئی نسل کو جو بے مہار جنسی آزادی بخشی ہے اس نے خاندانی نظام کو تباہ کر دیا ہے۔ ہمارے بڑے شہر کثرت آبادی سے پھٹنے کو ہیں اور وہاں جرائم کی بھرمار ہے۔"

"غرض ہم دیکھ رہے ہیں کہ جدید ٹیکنالوجی نے جہاں ہمیں سہولتیں دی ہیں وہیں ایسے دکھ بھی دیئے ہیں جن کا جدید سائنس و ٹیکنالوجی کے پاس کوئی حل نہیں اور اگر خدانخواستہ نیوکلیئر یا کیمیائی جنگ چھڑ گئی تو انسانی تہذیب کلیۃً تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ ہم جس شیطانی پنجے میں جکڑے ہوئے ہیں وہ اس کا متقاضی ہے کہ ہم کسی متبادل اور نئے تمدنی/تہذیبی ڈھانچے کی دریافت کے بارے میں غور کریں۔"

علاوہ ازیں پوسٹ ماڈرنسٹ مغربی فلاسفرز اور مفکرین نے ٹیکنالوجی کے کلچر اور مذہب پر اثرات کا بھی تفصیل سے جائزہ لیا ہے مثلاً لوئیس ممفورڈ (Lewis Mumford) کی عمر بھر کی تحقیق کا نتیجہ یہ ہے کہ 'کلچر اور ٹیکنالوجی باہم اس طرح مربوط ہوتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا' اور یہ کہ مشینی سٹائل (mechanization) کے غلبے سے اس معاشرے کی کلچرل بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں جو ٹیکنالوجی کو جنم دیتا ہے ------ یہاں تک کہ وہ' اس معاشرے کے لیے متبادل مذہب بن کر رہ جاتا ہے'۔ (34)

اینڈریو طاتسکو (Andrew Tatusko) ٹیکنالوجی اور مذہب پر اپنے تحقیقی مقالے میں کہتا ہے کہ 'ٹیکنالوجی جس معاشرے کی پیداوار ہوتی ہے اسی کے کلچر کی مظہر ہوتی ہے' اور یہ کہ 'کسی کلچر میں ٹیکنالوجی اس کے اندرونی حقائق (inward reality) کا خارجی اظہار ہوتی ہے'۔ وہ مزید کہتا ہے کہ 'مارٹن ہائیڈیگر جیسا ٹیکنالوجی مخالف ہو (35) یا مارشل میک لوہان جیسا ٹیکنالوجی کا مداح، (36) سب اس بات پر متفق ہیں کہ ٹیکنالوجی میں ایک ایسی زبردست نادیدہ قوت ہوتی ہے جو

معاشرے کے تصورات علم، مذہبی معتقدات اور اس کی سماجی اقدار کی صورت گری کرتی ہے‘‘ (37)

نیل پوسٹ مین کا رویہ ٹیکنالوجی کے حوالے سے معتدل ہے لیکن اس کے باوجود اس کی رائے یہ ہے کہ ’’ٹیکنالوجی انسان کی ایک ایسی دوست ہے جو اپنے اثرات کا گہرا جائزہ لیا جانا پسند نہیں کرتی بلکہ یہ اعتماد اور اطاعت کا مطالبہ کرتی ہے اور اکثر لوگ اس کا یہ مطالبہ بخوشی تسلیم کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں کیونکہ اس کے فوائد بے شمار ہیں۔ تاہم اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس دوست کا ایک دوسرا تاریک رخ بھی ہے اور اس کے فوائد انسانیت سے بھاری قیمت طلب کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسا کلچر تخلیق کرتی ہے جو اخلاقی بنیادوں سے محروم ہوتا ہے یہ ان ذہنی ارتباطات اور سماجی تعلقات کو بہت کمزور کر دیتی ہے جو انسانی زندگی کو اس کرۂ ارض پر رہنے کے قابل بناتے ہیں‘‘۔ پوسٹ مین کمپیوٹر کو ایک ایسی ’’آمرانہ ٹیکنو کریسی‘‘ سے تشبیہ دیتا ہے جو فطرتاً انسان کے اندر منفی جذبات اور رویے ابھارتی ہے (38)۔‘‘

ظاہر ہے پوسٹ ماڈرن فلسفیوں اور دانشوروں کی مغربی ٹیکنالوجی کی یہ مخالفت ان کا ایک داخلی معاملہ ہے۔ وہ اپنے فکری پیراڈائم کے اندر رہتے ہوئے اور مغربی تہذیب کی فکری اساسات کو چیلنج کیے بغیر صرف اس کے مضر اثرات اور تخریبی ثمرات پر تنقید کررہے ہیں۔ ان کی لیاقت و ہنر مندی قابل ستائش ہے لیکن وہ اس فکری بلندی تک ہنوز نہیں پہنچ سکے کہ اپنی بنیادی فکری اساسات کو چیلنج کریں اور اپنے فکری پیراڈائم سے باہر نکل کر اور اس سے اوپر اٹھ کر یہ سوچ سکیں کہ خرابی کی بنیاد پیراڈائم کا غلط استعمال نہیں بلکہ پیراڈائم کا غلط ہونا ہے اور یہ کہ خرابی جزوی اور فروعی نہیں بلکہ بنیاد ہی غلط ہے۔ جو مغربی دانشور اور مفکر بھی اس سطح پر سوچے گا وہ اسلام کی عظمت کا قائل ہوجائے گا کیونکہ اسلام ہی وہ منہاج مہیا کرتا ہے جو فطری بھی ہے اور عقلی بھی اور وہ ان سارے انسانی مسائل کا قابل عمل حل بتاتا ہے جنہوں نے آج کے انسان کو تنہا اور دکھی کر دیا ہے۔ مسلمانوں کی کمزوری یہ ہے کہ وہ عصر حاضر اس صحیح اسلامی فکر کا ایک جیتا جاگتا عملی ماڈل پیش نہیں کر سکے جو اہل مغرب کے لیے کشش و انجذاب کا باعث بن سکے۔ ظاہر ہے یہ مسلمانوں کی کمزوری ہے اسلام کی نہیں کیونکہ اسلام تو اپنا قابل عمل ہونا ثابت کر چکا ہے اور اسے عملی طور پر اپنانے ہی کے نتیجے میں مسلمانوں نے دنیا کو ایک شاندار تہذیب دی ہے جو ایک ہزار سال تک دنیا کی غالب تہذیب رہی ہے لیکن ہماری یہ کمزوری بہر حال غیر مسلم اہل دانش کے لیے اسلام کی طرف آنے میں ایک بڑی رکاوٹ تو ہے لہٰذا اب مغربی اہل علم کو چاہیے کہ وہ اس رکاوٹ کو عبور کر کے اسلامی فکر کی قوت و صلابت کا مطالعہ کریں، خصوصاً

قرآنِ حکیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت مبارکہ کا، اور جب وہ ایسا کریں گے تو وہ اسلامی پیراڈائم کے صحیح اور قابل عمل ہونے سے انکار نہ کرسکیں گے۔

مبحث چہارم: پس چہ بائد کرد

یہ واضح ہوجانے کے بعد کہ مغربی ٹیکنالوجی خلاف اسلام اقدار کو جنم دیتی ہے اب سوال یہ ہے کہ مسلم معاشرے کے لیے اس جدید مغربی ٹیکنالوجی کے حوالے سے صحیح راہ عمل کیا ہوسکتی ہے؟ ممکنہ مسلم ردعمل کو ہم چار انواع میں تقسیم کرسکتے ہیں:

1۔ مغربی ٹیکنالوجی کو قبول کرنے میں کوئی حرج نہیں

2۔ مغربی ٹیکنالوجی کو قبول کرلیا جائے لیکن اس کے بُرے اور غیر اسلامی اثرات سے بچنے کی سعی کی جائے

3۔ مغربی ٹیکنالوجی کو رد کر دیا جائے

4۔ متبادل ٹیکنالوجی خود پیدا کرنے کی سعی کی جائے

اب ان چاروں امکانات پر ہم کچھ روشنی ڈالیں گے:

1۔ مغربی ٹیکنالوجی کو قبول کرنا

چونکہ مغرب نے مسلمان ممالک پر قبضے کے دوران یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ اپنا غلام رکھنا ہے لہٰذا اس ہدف کو پانے کے لیے اس نے ہر وہ حربہ اختیار کیا جو اس کے لیے ضروری تھا۔ چنانچہ یہ اسی کا شاخسانہ ہے کہ اس نے:

۔ مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت بلکہ مسلم روایت پر مبنی سارا ریاستی ڈھانچہ مسلم ممالک پر قبضے کے دوران توڑ ڈالا اور مغربی فکر و تہذیب پر مبنی ڈھانچہ ریاستی قوت سے نافذ کردیا۔

۔ بڑے مسلمان ملکوں کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تبدیل کردیا۔

۔ جب اسے جنگ عظیم اوّل و دوم کے بعد مجبوراً مسلمان ملکوں کو آزادی دینا پڑی تو اس نے اقتدار ایسے طبقات کو منتقل کیا جو اس کے تربیت یافتہ، اس کی تہذیب سے مرعوب اور اس کے رسیا تھے اور اسے ہی نوزائیدہ مسلم ممالک میں رائج کرنا چاہتے تھے۔

۔ پھر اس برائے نام آزادی کے بعد بھی اہل مغرب نے پُرامن لبادے میں مسلم ممالک کے معاشی نظام کو بہتر نہ ہونے دینے اور اس کے نظام تعلیم اور میڈیا ۔۔۔۔وغیرہ کو اپنے فکری شکنجے میں کسے رکھنے کے اقدامات جاری رکھے۔ ان سب اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ موجودہ مسلمان حکمرانوں

کی اکثریت مغربی فکر و تہذیب سے مرعوب ہے، اسے ہی اپنے ہر مسئلے کا حل سمجھتی ہے اور وہ مغربی ٹیکنالوجی کو اپنے معاشرے میں رواج دینے ہی کو ترقی کا زینہ سمجھتی ہے۔ علاوہ ازیں مسلم معاشرے کے پڑھے لکھے طبقات جیسے سول اور فوجی بیوروکریسی اور بعض صحافی و دانشور اور مراعات یافتہ طبقات میں سے جاگیر دار اور سرمایہ دار مغربی ٹیکنالوجی کو اپنے معاشرے میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ دینی طبقات میں سے بھی اکثر ایسے ہیں جنہوں نے جدید مغربی ٹیکنالوجی اور اس کے بُرے اثرات سے صَرف نظر کر رکھا ہے اور وہ اسے رد نہیں کرتے بلکہ ان میں سے اکثر وہ ہیں جنہوں نے اس مسئلے پر کبھی سنجیدگی سے غور ہی نہیں کیا کہ یہ بھی کوئی چیلنج ہے۔

۔ دینی عناصر میں تھوڑے ہی ایسے ہیں جو جدید ٹیکنالوجی کے بُرے اور غیر اسلامی اثرات کی وجہ سے اسے رد کرتے ہوں اور اپنے متبعین کو اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہوں۔ اگرچہ اس سلسلے میں کسی مستند سروے کے اعداد و شمار موجود نہیں ہیں تاہم ہمارا محتاط اندازہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کرام اور دینی قائدین کی اکثریت کے پاس گھروں میں ٹی وی سیٹ موجود ہیں اور ان کے پڑھے لکھے بچوں کے پاس کمپیوٹر بھی موجود ہیں۔

2۔ جدید ٹیکنالوجی کو قبول کرنا لیکن اس کے بُرے اثرات سے بچنے کی سعی کرنا

اس رویے کے حامل بعض افراد بھی ہیں اور مسلم ممالک بھی لیکن یہ اپروچ اکثر و بیشتر غیر مؤثر ثابت ہوئی ہے۔ مسلم ممالک تو رہے ایک طرف خود مغربی ممالک میں بھی بعض مہذب والدین کوشش کرتے ہیں کہ ان کے بچوں کو ان ویب سائٹس تک رسائی حاصل نہ ہو جن میں مخرب اخلاق مواد موجود ہوتا ہے لیکن مجموعی ماحول ایسا بن گیا ہے اور انفارمیشن کا ایسا سیلاب آچکا ہے کہ اس طرح کی پابندیاں بالعموم ناکامی پر منتج ہوتی ہیں۔ مسلمان ممالک میں سے بھی بعض (مثلاً سعودی عرب) کوشش کرتے ہیں کہ ISPs کے ذریعے کوشش کی جائے کہ مخرب اخلاق مواد عوام تک نہ پہنچے۔ اسی طرح بعض افراد کوشش کرتے ہیں کہ ان کے بچے ٹی وی سے صرف خبریں سنیں یا صرف کارٹون دیکھیں۔ اول تو اس طرح کے افراد کم ہیں جو مستقل مزاجی سے اس پابندی پر خود عمل کریں اور بچوں سے کرا سکیں اور بالعموم یہ ہوتا ہے کہ ابتداء میں کچھ پابندیاں قبول کر لی جاتی ہیں جو آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہیں؟ پھر خبروں اور کارٹونز کے ذریعے بھی تو زہر منتقل ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں بھی اپنے مواد اور پیشکش میں نہ معروضی ہوتے ہیں نہ ویلیو نیوٹرل۔

یہ نقطۂ نظر کہنے کو تو آسان معلوم ہوتا ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کو بُرا کہنے کی بجائے اپنی مذہبی

تعلیمات و روایات پر عمل کرنا چاہیے اور اپنے نفس پر کنٹرول کرنا سیکھنا چاہیے تاکہ جدید ٹیکنالوجی (مثلاً ریڈیو، ٹی وی، کمپیوٹر) کے استعمال کی خواہش ہی پیدا نہ ہو لیکن اس پر عمل کرنا مشکل ہے اس لیے کہ مغربی فکر و تہذیب کے غلبے کی وجہ سے مسلمان معاشروں میں اتنا مؤثر تعلیمی، تربیتی اور ترغیبی نظام موجود ہی نہیں جو عوام خصوصاً نوجوانوں کو اسلامی نقطۂ نظر پر اتنا یکسو کردے کہ وہ غیر اسلامی طرزِ عمل کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھیں اور نہ گھروں میں ایسا ماحول اور تربیت میسر ہے کہ بچے اسلامی طرزِ زندگی پر مکمل یکسو ہوجائیں۔ لہٰذا جدید ٹیکنالوجی کو قبول کرکے اور اسے برتتے ہوئے اس کے بُرے اور غیر اسلامی اثرات سے بچنے کی کوشش اکثر کامیاب نہیں ہو پاتی اگرچہ ایسی کسی سعی کے محمود ہونے کے بارے میں دو رائیں ہو ہی نہیں سکتیں۔

3۔ مغربی ٹیکنالوجی کو رد کرنا

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ہے کہ اس وقت عملاً صورت حال یہ ہے کہ موجودہ مسلم معاشروں میں بہت تھوڑے دینی عناصر ایسے ہیں جو جدید مغربی ٹیکنالوجی کو اس کے منفی اور غیر اسلامی اثرات کی وجہ سے رد کرتے ہوں لیکن نظری طور پر، جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا، اسلامی تعلیمات اور مفاد کا تقاضا یہ ہے کہ سارا مسلم معاشرہ بحیثیت مجموعی مغربی ٹیکنالوجی کو اس کے منفی اور غیر اسلامی اثرات کی وجہ سے رد کردے۔ اس کے لیے ہماری رائے میں اس امر کی ضرورت ہے کہ پہلے تمام دینی عناصر کو اس طرف متوجہ کیا جائے اور جدید ٹیکنالوجی کے بُرے اور غیر اسلامی اثرات کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی جائے اور انہیں بتایا اور مطمئن کیا جائے کہ ایسی ٹیکنالوجی اسلامی معاشرت کو برباد کر رہی ہے، اسلامی اقدار کو ختم کر رہی ہے اور اس کا ترک واجب ہے۔ بڑے دینی مدارس اور یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے علوم اسلامیہ و ابلاغ عامہ وغیرہ کو اس موضوع پر تحقیق کرانی چاہیے یعنی تخصص اور ایم فل و پی ایچ ڈی کے طلبہ سے اس موضوع پر تھیسز و تحقیقی مقالہ جات لکھوانے چاہئیں کہ مسلم معاشرے پر جدید ٹیکنالوجی کے کیا اثرات پڑ رہے ہیں؟ غرض جب علماء اس پر مطمئن ہوجائیں اور جدید مغربی ٹیکنالوجی کے استعمال کے خلاف باقاعدہ فتویٰ دے دیں تو پھر ہی معاشرے کے عام دین دار افراد کے اندر کچھ شعور ابھر سکتا ہے اور وہ اس طرح کی اخلاقی لحاظ سے مضر ٹیکنالوجی کا استعمال ترک کر سکتے ہیں۔ یہ کام پرائیویٹ سیکٹر میں ہوسکتا ہے اور جب دینی عناصر اس پر متحد اور یکسو ہوجائیں تو پھر وہ مسلم حکومت سے بھی مطالبہ کر سکتے ہیں کہ وہ اس طرح کی مضر اخلاق ٹیکنالوجی کے

خلاف حرکت میں آئے۔

ایک مسلم حکومت اگر اپنے عوام کو جدید ٹیکنالوجی کے مضر اثرات سے بچانا چاہے تو وہ متعدد اقدامات کر سکتی ہے مثلاً اس کی درآمد پر پابندی لگا سکتی ہے، اندرون ملک اس کی مینوفیکچرنگ بند کر سکتی ہے یا اس پر ٹیکس لگا کر اور اسے مہنگا کر کے عوام کی دسترس سے اسے دور کر سکتی ہے۔۔۔وغیرہ۔لیکن ظاہر ہے کوئی حکومت ایسے اقدامات اسی وقت کرے گی جب اسے پتہ ہو کہ یہ عوام کا مطالبہ ہے یا کم از کم عوام اس میں اس کا ساتھ دیں گے لیکن اگر عوام ہی ایسا نہ چاہیں تو حکومت کیا کر سکتی ہے اور وہ کیوں کرے؟ لہٰذا اگر کوئی مسلمان حکمران اپنے عوام کو جدید ٹیکنالوجی کے مضر اثرات سے بچانا چاہے تو اسے علماء، صحافیوں، دانشوروں، میڈیا اور صحیح نظام تعلیم و تربیت کے ذریعے ایک لمبے عرصے تک عوام کی ذہن سازی کرنا ہوگی، پھر ہی اس کے کچھ تعمیری اثرات نکل سکتے ہیں ورنہ اس وقت جو حالت ہے کہ مسلم معاشرہ مغربیت (ویسٹرنائیزیشن) کے سیلاب کی زد میں ہے، مسلم حکمران مغرب کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں اور پبلک سیکٹر کے علاوہ پرائیویٹ سیکٹر میں بھی تعلیمی نظام اور میڈیا مغربی فکر و تہذیب کی نقالی کر رہا ہے اور مغربی افکار و اقدار ہی کو پروموٹ کر رہا ہے تو ان حالات میں مغربی ٹیکنالوجی کو کون رد کرے گا بلکہ اس بارے میں سوچے گا ہی کیوں؟

4۔ متبادل ٹیکنالوجی کی حکمت عملی

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ٹیکنالوجی صرف مغرب پیدا کرتا ہے اور مسلمان معاشرے محض اس کا استعمال کرنے والے ہیں۔ ہماری رائے میں یہی خرابی کی جڑ ہے۔ظاہر ہے مغرب جب ٹیکنالوجی پیدا کرے گا تو اپنے فکری و تہذیبی پیراڈائم کے اندر رہ کر ہی کرے گا اور مسلمان معاشرے جب تک خود ٹیکنالوجی پیدا نہیں کریں گے تو ظاہر ہے دوسروں کی پیدا کردہ ٹیکنالوجی ہی استعمال کریں گے۔ سوال یہ ہے کہ مسلمان امت ٹیکنالوجی خود پیدا کیوں نہیں کرتی؟ اور یہ بات بھی ظاہر ہے کہ جب وہ خود ٹیکنالوجی پیدا کرے گی تو اپنی پیراڈائم کے اندر رہ کر ہی کرے گی یا اسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔ مسلمان امت خود ٹیکنالوجی کیوں پیدا نہیں کر رہی؟ اس کے جواب میں چند باتیں کہی جا سکتی ہیں:

1۔ امت میں ٹیلنٹ نہیں ہے یعنی اس کے پاس باصلاحیت افراد نہیں ہیں

2۔ امت کے پاس مادی وسائل نہیں ہیں

3۔ امت کو اس کا احساس نہیں ہے۔

ہماری رائے یہ ہے کہ امت میں ٹیلنٹ کی کمی نہیں (یا کم از کم ایسا قحط نہیں کہ کام کی ابتداء ہی نہ ہوسکے)۔ ہمارے بہت سے افراد مغرب کے سائنسی و تحقیقی اداروں میں قابلِ فخر خدمات انجام دے رہے ہیں صرف اس وجہ سے کہ وہاں ان کو مناسب ماحول اور ضروری سہولتیں میسر ہیں جب کہ مسلم ممالک میں انہیں مناسب ماحول اور سہولتیں میسر نہیں۔ امت کے پاس مادی وسائل کی بھی کمی نہیں۔ کئی مسلم ممالک کے پاس انفرادی طور پر مادی وسائل کی کمی ہوسکتی ہے لیکن اگر مسلمانوں میں اتحاد ہو(جو ہونا چاہیے) تو وسائل کی کمی کا عذر قابل قبول نہیں ہوسکتا کیونکہ کئی مسلم ممالک (خصوصاً تیل پیدا کرنے والے ممالک) کے پاس اربوں ڈالر موجود ہیں جو مغرب کے یہودی بنکاروں کے پاس پڑے ہیں اور امت کے کسی مفید استعمال میں نہیں آرہے لہٰذا مسلم ممالک اگر چاہیں تو مل کر سائنسی تحقیقی کے ایسے بڑے ادارے قائم کر سکتے ہیں جو تخلیقی تحقیق کے ذریعے خود ٹیکنالوجی پیدا کریں۔

ایک ضمنی بات۔ اگر کوئی کہے کہ مسلم 'امت' کہاں ہے؟ یعنی مسلمانوں میں اتحاد کیوں نہیں ہے؟ تو اس کے لیے ہمیں اصلاً تو اپنے گریباں میں جھانکنا چاہیے کہ آخر کیوں ہمارے حکمران دوسروں کے ایجنٹ بن کر امت کے اتحاد میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں کیونکہ اگر ہم سچ مچ متحد ہوں تو ان قوتوں کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچنے کا بھی سوچا جا سکتا ہے جو ہمیں متحد نہیں ہونے دے رہیں اور ہمیں لڑانے کی سازشیں کر رہی ہیں۔ آخر ہم کیوں نہیں سوچتے کہ یہ ہم ہی تھے جن کے جذبہ وجنوں کے آگے محض تیرہ برس میں اس وقت کی دو سپر طاقتیں ڈھیر ہو گئی تھیں۔ اور یہ ابھی کل ہمارے دیکھے کی بات ہے کہ ایک ورلڈ پاور کے ٹوٹنے میں ہم نے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ ہم اگر چاہیں تو آج کی واحد ورلڈ پاور کی سازشوں سے بھی نمٹ سکتے ہیں۔ ضرورت صرف صحیح سمت میں سوچنے اور عمل کرنے کی ہے اور جو ایسا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی مدد بھی ان کے شامل حال ہوتی ہے۔

ہم درست سمت میں کیوں نہیں سوچتے؟ درحقیقت ہمارے ہاں جس چیز کی کمی ہے وہ فکری خود مختاری اور ذہنی آزادی ہے۔ اور ظاہر ہے فکری خودمختاری اسی وقت آئے گی جب ہم اپنی فکر کو جانتے ہوں گے، اس سے وابستہ اور پیوستہ ہوں گے اور اس کے تقاضوں کو سمجھتے ہوں گے۔ گویا ہمارا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی شناخت اور آزادی کھو دی ہے۔ ہم اپنی فکر سے وابستگی میں کمزوری کی بناء پر مضمحل ہوئے ہی تھے کہ ہمارا حریف (یورپ) ابھرا، اس نے ہماری لڑکھڑاتی ہوئی دیوار کو دھکا دے کر گرا دیا۔ پھر اس دیوار کو اپنی مرضی سے بنایا۔ اب وہ ہماری نئی نسلوں کو بتاتا ہے کہ یہی تمہاری

اصلی دیوار ہے اور ہم ہیں کہ گردن ہلائے چلے جارہے ہیں کہ مستند ہے آپ کا فرمایا ہوا۔ یورپ و امریکہ نے صرف مسلمان ملکوں کو فتح نہیں کیا تھا بلکہ اس نے ان کے دل و دماغ کو بھی فتح کیا اور اس کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی اور کامیابی سے مرضی وخواہش کے نتائج حاصل کیے۔ یقین نہ آئے تو لارڈ میکالے کی 1832ء کی تعلیمی رپورٹ نکال کر دیکھ لیجئے۔ اس نے کہا تھا ہمارا نظام تعلیم ایسا ہونا چاہیے کہ یہ لوگ نام کے تو بے شک مسلمان اور ہندو رہیں لیکن شائق اور رسیا ر ہماری فکر وتہذیب کے ہوں۔ (39) چنانچہ آج ہم زاغوں کو یاد ہی نہیں رہا کہ ہم دراصل کبھی شاہین ہوا کرتے تھے — شاہین جو اپنا شکار خود کرتا ہے اور زاغ جو کسی کے مارے ہوئے شکار کا بچا کھچا کھاتا ہے۔

تو ہمارا مسئلہ درحقیقت ذہنی وفکری آزادی کا فقدان ہے۔ جس دن ہم (یعنی ہمارے دانشور، علماء اور حکمران) جان جائیں گے کہ ہماری مغرب سے مختلف اور متضاد ایک الگ فکر ہے، ایک مستقل ورلڈ ویو ہے اور یہ ورلڈ ویو ایک خاص نوع کے فلسفۂ علم کو جنم دیتا ہے اور یہ فلسفۂ علم خاص نوع کے علوم وفنون کو پروان چڑھاتا ہے۔ اس دن ہم اپنی ٹیکنالوجی پیدا کرنے لگ جائیں گے۔ اس وقت تو حالت یہ ہے کہ ہم علوم وفنون میں مغرب کے نقال اور خوشہ چین ہیں اور اسی کو کمال سمجھتے ہیں اور اپنی شناخت کو کھو چکے ہیں۔ زاغ کو جب شاہین کا جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا یاد ہی نہ رہے تو وہ شکار کیا کرے گا؟ لہٰذا ہماری بنیادی ترین ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی ذات کا عرفان حاصل کریں، ہمیں اپنی شناخت تو یاد ہو۔ ہم اپنے آپ کو پہچانیں تو! غیروں کی فکری غلامی سے آزاد تو ہوں۔ جس دن ہماری یاداشت بحال ہوجائے گی کہ ہم زاغ نہیں شاہین ہیں اس دن ہم دوسروں کا کیا ہوا شکار نہیں کھائیں گے بلکہ اپنا شکار خود کریں گے اور اپنی ٹیکنالوجی خود پیدا کریں گے۔

اور ہمیں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے اُس وقت کا انتظار نہیں کرنا ہے بلکہ اس کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ جس نے ہمیں ذہنی غلام بنایا تھا وہ سو نہیں گیا وہ اب بھی کوشاں ہے اور زیتون کی ڈالی سے لے کر ڈیزی کٹر بموں تک ہر ہنر ہم پر آزما رہا ہے۔ وہ اپنے علم وفکر ہی کی نہیں لوہے کی تلوار لیے بھی ہمارے سر پہ کھڑا ہے کہ ہلنا مت ورنہ۔۔۔ لہٰذا ہم عرصۂ محشر میں ہیں۔ معاف کیجئے گا ہمیں شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا ہے لیکن جس دن ہمیں عرفان ذات حاصل ہوگیا، یہ بیڑیاں ٹوٹ جائیں گی جن میں ہم جکڑے ہوئے ہیں اور جب ہمارے ہاتھ کھل جائیں گے تو ہم نہ صرف اپنی بقاء کی جدوجہد کرنے کے قابل ہوجائیں گے بلکہ عزت وناموری کی پریاں پھول لیے ہماری راہ میں کھڑی ہوں گی۔ تجربہ

شرط ہے۔

تلخیص بحث

خلاصہ یہ کہ آج مغرب کا پوسٹ ماڈرنسٹ دانشور خود تسلیم کر رہا ہے کہ اس کی تہذیب کی پیدا کردہ سائنس وٹیکنالوجی انسانیت کے لیے مضر ہے لہٰذا ہمارا یہ مؤقف شک وشبہ سے بالا تر ہے کہ مغربی ٹیکنالوجی نہ صرف غیر فطری اور غیر انسانی ہے بلکہ یہ صحیح مذہبی فکر، اخلاقی روایات اور اسلامی اقدار کے لیے بھی تباہ کن ہے لہٰذا مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے پیراڈائم کے اندر رہتے ہوئے ضروری ٹیکنالوجی خود پیدا کریں اور مغربی ٹیکنالوجی کا استعمال ترک کر دیں۔ اس کام کی راہ میں بنیادی رکاوٹ مادی وسائل نہیں ہیں بلکہ یہ امر ہے کہ مسلمان عرفان ذات سے محروم ہیں اور حریت فکری سے تہی دامن ہیں اور انہیں پہلے اس چیلنج سے نمٹنے کی ضرورت ہے۔

مراجع وحواشی

۱۔ فہیم احمد خان، بیس مسلم ایجادات جنہوں نے دنیا بدل دی، ماہنامہ گلوبل سائنس کراچی، شمارہ ۷ ۱۴، مارچ ۲۰۱۰ء

2. John W. Draper, *History of Intellectual Development of Europe*, University of Michigan, Detroit, 2000.

3. Robert Brieffault, *The Making of Humanity*, G. Allen & Unvin Ltd, London, 2009.

4. George Sarton, *Indroduction to the History of Science*, Krieger Publishing Co., Melbourne, Fla., 1975.

5. See for Example:
- David Strong et el (Ed.), *Technology and the Good Life*, University of Chicago Press, 2000.
- Hans Achterhuis (Ed.), *American Philosophy of Technology*, Indiana University Press, 2001.

6. ‘‘http:\\en.wikipedia.org\whki\critiquie of Technology’’ on May 8, 2010

7. Symon Ramo, *What is Wrong with Our Technological Society & How to Fix it?* McGraw Hill Book Co., Ny 1983, P. 8-9

8۔ یہ بات اسّی کی دہائی کے اوائل کی ہے۔ اب کینسر کی کئی اقسام کا علاج اگرچہ دریافت ہوگیا ہے لیکن بعض

اس سے بھی زیادہ مہلک بیماریاں ایسی ظاہر ہو چکی ہین جن کا جدید میڈیکل سائنس میں کوئی علاج نہیں جیسے ایڈز اور وہ مغرب کے مخصوص طرز زندگی کی پیداوار ہیں۔

9. Lewis Mumford, *Technics and Civilizatioin*, San Diego, CA: Har Court Braco, 1990, P. 53-54

10. Martin Heidegger, *The Question Concerning Technology & Other Essays*, San Francisco: Harper: Collins, 1982, P-46.

11. Marshall McLuhan, *Understanding Media: The Extensions of Man*, Cambridge, MA: MIT Press, 1964, P-18.

12. Andrew Tatusko, *The Sacrament of Civilization: The Ground Work of a Philosophy of Technology for Theology*, P-3, on 'Tatusko@sku.edu.' on May 20, 2010.

13. Neil Postman, *Technolopy: The Surrender of Culture to Technology*, New York, NY: Vintage, 1992, P-45.

14. The Encyclopedia of Education, *Lord Macaulay's Historic Report* of February 2, 1835 on Indian Education 4:570, Crowell Collier Education Corporation, USA 1971

پروفیسر ڈاکٹر جاوید اقبال ندیم

اسلام اور جدید ٹیکنالوجی

انسان کی فلاح و بہبود کے لیے مذاہب نے ہر دور میں خصوصی کردار ادا کیا ہے۔ انسان اپنے تمام مسائل کا حل مذہب میں تلاش کرتا رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ علوم میں اضافہ ہوتا گیا اور انسان زیادہ باشعور ہوتا چلا گیا۔ فکر و فلسفہ نے ذہنی انقلاب پیدا کیا جبکہ سائنس مادی انقلاب کا باعث بنی۔ مذہبی اصطلاحات و مسائل فلسفہ کی مدد سے سمجھے جاتے ہیں جبکہ سائنس کا کام کائنات کے کسی خاص گوشے کا مرتب، مربوط اور تحقیقی انداز میں جائزہ لینا ہوتا ہے۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو دین کا درجہ بھی رکھتا ہے جس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ قرآن مجید میں علمی، فکری اور تحقیقی لحاظ سے تسخیر کائنات کا حکم دیا گیا ہے تا کہ دنیا میں موجود ہر شے سے استفادہ کیا جا سکے اور ہر چیز کو انسان اپنے تصرف میں لائے۔

فرمان الٰہی ہے کہ ''اور جو کچھ زمین اور آسمانوں میں موجود ہے انسانوں کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے'' (لقمان: ۳۱:۲۰)۔ یہ دین اسلام ہی ہے جو انسان کو سوچنے سمجھنے اور فکر و تدبر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اللہ کی طرف سے انسان کو حکمت و دانائی ودیعت کی گئی ہے جس سے وہ تمام مسائل کا حل

تلاش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے ''جسے حکمت دی گئی اسے بہت بڑی بھلائی عطا کی گئی'' (البقرہ ۲۶۹:۲)۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ ''حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے''۔

اوپر درج آیتِ مبارکہ اور فرمانِ رسول ﷺ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حکمت و دانائی دراصل تحقیق و جستجو کی طاقت بخشتی ہے اور صرف وہی لوگ تحقیق کر سکتے ہیں جو درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے ہوں اور ان میں کائنات کی تسخیر، جدید علوم سیکھنے اور نئی ایجادات کرنے کی تحریک موجود ہو۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے مختلف انداز سے تلقین کی ہے کہ پوری کائنات میں اس کے لیے مختلف الانواع خزانے دفن ہیں، غذائیں موجود ہیں ان کو حاصل کرنا اور مزید تحقیق سے بہتر بنانا اس کا کام ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے ''اور اللہ نے اس (زمین) میں اس کے رہنے والوں کی غذائیں مقرر کر دیں، چار دن میں سب جستجو کرنے والوں کے لیے برابر ہیں'' (فصلت ۱۰:۴۱)

اس آیت مبارکہ میں زمین میں غذائیں تلاش کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ انسان اپنی عقل و دانش استعمال کرے اور جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرے۔ ان آیاتِ مبارکہ پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ خدا دنیا کے تمام انسانوں سے مخاطب ہے اور وہ سب کا رب ہے یعنی رب العالمین۔ قرآن مجید میں زمین، آسمانوں، سمندروں، پہاڑوں اور ہواؤں کے متعلق بیان کیا گیا ہے اور بار بار خدا کی نشانیوں پر غور کرنے کے لیے کہا گیا ہے ''قسم ہے ان ہواؤں کی جو نفع پہنچانے کے لیے بھیجی جاتی ہیں پھر ان ہواؤں کی جو تندی سے چلتی ہیں جن سے خطرات کا احتمال ہوتا ہے اور ان ہواؤں کی جو بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں، پھر ان ہواؤں کی جو بادلوں کو متفرق کر دیتی ہیں جیسا بارش کے بعد ہوتا ہے، پھر ان ہواؤں کی جو دل میں اللہ کی یاد یعنی توبہ کا یا ڈر لانے کا القا کرتی ہیں کہ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ ضرور ہونے والی ہے'' (المرسلات ۷۷:۱۔۷)

اس آیت مبارکہ میں ہوا کی اقسام بتائی گئی ہیں اور ان پر غور کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا جغرافیہ اور موسمیات کے بارے میں آج جو تحقیق کی جارہی ہے اس کے بارے میں قرآن مجید میں چودہ سو سال قبل وضاحت کر دی گئی ہے اور مسلمانوں کو ہواؤں کو مسخر کرنے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ وہ انہیں اپنے تصرف میں لا سکیں اور شدید ہواؤں سے پیدا ہونے والے طوفانوں سے بچا جا سکے۔ اسی

لیے ہوا کی مدد سے برقی رو پیدا کی گئی ہے۔

قرآن مجید میں سائنسی علوم میں ترقی کرنے اور غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے سورۃ النحل میں ارشادِ خداوندی ہے: ''وہ تمہارے لیے کھیتی اور زیتون اور کھجور اور انگور اور ہر قسم کے پھل اُگاتا ہے۔ بے شک اس میں سوچنے والوں کے لیے دلیل ہے اور اس نے تمہارے لیے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر کیا اور ستارے اس کے حکم سے مسخر ہیں بے شک اس میں عقل مند لوگوں کے لیے چند دلیلیں ہیں''(النحل ۱۶:۱۱۔۱۲)

قرآن مجید میں بارہا یہ پیغام دیا گیا ہے کہ تحقیق کا انداز اپنایا جائے۔ غور وفکر کی دعوت دی گئی ہے اور جو عقل مند ہوتے ہوئے بھی غور وفکر نہیں کرتے ان کو چوپایوں کے برابر کہا گیا ہے ارشادِ خداوندی ہے: ''بلاشبہ بدترین جانور اللہ کے نزدیک وہ بہرے گونگے لوگ ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے''(الانفال ۸:۲۲)۔ ''بھلا یہ لوگ قرآن میں غور کیوں نہیں کرتے یا یہ ہے کہ ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں''(محمد ۴۷:۲۴)

اس آیت مبارکہ میں غور وفکر نہ کرنے والوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں یہ سوچتے کیوں نہیں؟ گویا سوچنے اور فکر و تدبر کرنے سے علوم میں اضافہ ہوتا ہے اور سائنسی ایجادات سامنے آتی ہیں۔

مسلمان سائنس دانوں اور فلسفیوں نے آٹھویں اور چودھویں صدی کے درمیانی عرصہ میں فکر و فلسفہ اور سائنسی علوم پر بے حد کام کیا اور اس طرح فکری سرمایہ کاری کرکے پوری انسانیت کی خصوصی خدمت کی۔ مسلمانوں نے درجۂ کمال کا شاندار کارنامہ سرانجام دیا۔ سائنس، فلکیات، طب، جراحی، انجنیئر نگ اور فلسفہ کے میدان میں ان کے نظریات اوّلین حیثیت رکھتے ہیں۔ ان عظیم مسلمان فلسفیوں میں یعقوب ابن اسحاق الکندی، جابر بن حیان، الفارابی، موسیٰ الخوارزمی، ابن الہیثم، ابن رشد، ابن سینا، ابن خلدون، البیرونی، عمر الخیام، امام غزالی، ابنِ عربی، الرازی، ابن طفیل، ابن ماجہ، ابن مسکویہ، ابن تیمیہ اور نصیر الدین الطوسی شامل ہیں۔

مسلم فلسفہ کے بانی الکندی نے سب سے پہلے یہ تصور پیش کیا تھا کہ کوئی دھات کسی دوسری دھات میں تبدیل نہیں ہوسکتی۔ ابن مسکویہ وہ عظیم فلسفی ہے جس نے نظریہ ارتقاء پیش کیا۔ سائنسی علوم کو فلسفہ بنیادیں مہیا کرتا ہے۔ جہاں جا کر سائنس رک جاتی ہے وہاں دوبارہ فلسفہ کی ضرورت محسوس

ہوتی ہے۔مسلمان فلسفیوں نے یونانی فلسفہ کا ترجمہ عربی زبان میں کیا خصوصاً ارسطو کی منطق کو انہوں نے متعارف کرایا اور بعد میں یہی علمِ منطق دورِ جدید میں سائنسی علوم کی ابتداء کا باعث بنا۔مفروضے قائم کیے جانے لگے اور تحقیق میں پیش رفت ہوئی۔کوپرنیکس، گلیلیو، نیوٹن اور آئن سٹائن جیسے جدید سائنس دانوں کی فکر کو بنیادیں بھی وہیں سے حاصل ہوئیں۔گویا مسلمان فلسفیوں نے قدیم اور جدید فلسفہ کے درمیان پل کا کردار ادا کیا۔

مسلمان فلسفیوں نے قرآن مجید کی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے اس بات کو مدِ نظر رکھا کہ انہیں مظاہرِ فطرت پر غور وفکر کرنے کی ہدایت و دعوت دی گئی ہے۔ سب سے پہلا مسلمان فلسفی ابو یوسف یعقوب ابن اسحاق الکندی طب، فلسفہ، حساب، ہندسہ، منطق اور علم النجوم کا عالم تھا۔ اس نے مختلف موضوعات پر چھوٹی بڑی تقریباً ۲۴۱ کتابیں لکھیں جو یقینا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔ابونصر الفارابی کو فلسفۂ ارسطو کے عظیم شارح ہونے کے سبب معلم ثانی کہا جاتا ہے۔مورخ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ الفارابی ۷۰ زبانوں کا ماہر تھا اس نے ارسطو کی مشکل منطق کو آسان زبان میں بیان کیا اور منطق، فلسفہ، طبعیات، سیاست، موسیقی اور ریاضی کے مختلف موضوعات پر تقریباً ۸۰ کتابیں لکھیں۔

عظیم مسلمان فلسفی ابن سینا نے حاکمِ رے مجد الدولہ اور ہمدان کے حاکم شمس الدولہ کی بیماریوں کا علاج اس وقت کیا جب تمام معالج بے بس ہوگئے تھے۔ابن سینا کو مسلمان فلسفیوں میں طب اور طبعیات میں سب سے بڑا حکیم تسلیم کیا جاتا ہے۔یہ سائنسی دور تجرباتی دور تھا۔مسلمانوں نے طریق فکر و تحقیق کی بنیاد مشاہدات اور تجربات پر رکھی تھی۔منطق استقرائیہ سے کام لیا اور یونانی منطق استخراجی کو چھوڑ دیا۔ابن سینا نے طب، علم النفس اور طبعیات میں اعلیٰ مقام حاصل کیا۔یہی وجہ ہے کہ ابن سینا کی قانونِ طب کو یورپ میں طب کی بائبل کا درجہ دیا گیا تھا۔ابن مسکویہ اپنی تصانیف الفوز الاصغر، تجارب الامم اور تہذیب الاخلاق کی بنا پر ہر جگہ اور ہر زمانے میں مشہور ہوا۔فلسفہ اخلاق دینے کے بعد ابن مسکویہ نے نظریہ ارتقاء پیش کیا جو عہد جدید کے نظریات ارتقاء سے حیران کن حد تک مماثلت رکھتا ہے۔مشہور زمانہ ڈارون اور لیمارک کا نظریہ ارتقاء ابن مسکویہ ہی کے نظریہ ارتقاء کی توضیح معلوم ہوتا ہے۔ابوریحان محمد البیرونی ۳۶۳ھ کا طریق تحقیق مکمل طور پر سائنسی فکر پر مبنی ہے۔ البیرونی نے حساب، اجرامِ سماوی اور مقدارِ مسافت، دوری اور بلندی کا حساب، قبلہ کی سمت، خطِ مماس کا اندازہ اور توازن صحیح طریقہ سے پہلی مرتبہ پیش کیا۔مسلمان فلسفیوں میں ایک بڑا نام خراسان

کے علاقہ طوس میں پیدا ہونے والے فلسفی حجتہ الاسلام ابو حامد محمد ابن محمد الطوسی الشافعی الغزالی کا ہے۔
ابن رُشد وہ عظیم مسلمان فلسفی ہے جس نے ارسطو کے فلسفہ کی تشریح و ترجمہ بڑی محنت، لگن اور دقتِ نظر سے کیا۔ ابن خلدون نے فلسفۂ تاریخ بیان کیا اور مشہور زمانہ کتاب ''مقدمہ ابن خلدون'' تحریر کی۔ اسے بجا طور پر بابائے عمرانیات کہا جاتا ہے۔

مسلمان فلسفیوں نے فکر کی انتہائی بلندیوں کو چھوا۔ ہم بجا طور پر ماضی میں پیش کیے گئے مسلمان فلسفیوں کے افکار و نظریات پر فخر کر سکتے ہیں کہ ان کی محنت و کاوش سے مغرب کے جدید فلسفیوں نے بھرپور استفادہ کیا۔ اگر مسلم فلسفی یہ کام نہ کرتے تو آج فلسفہ کی دنیا میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو جاتا اور فلسفہ جدید بھی جنم نہ لیتا یا کسی اور شکل میں سامنے آتا۔

مسلمان فلسفی ساری عمر دیگر دھاتوں کو قیمتی دھات سونے میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ قرآنی تعلیمات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے تحقیق و تفحص کے میدان میں اپنی کارکردگی دکھاتے رہے۔ انہوں نے اس فکری سرمایہ کاری سے رہتی دنیا تک اپنا نام متعارف کرا دیا۔ وہ سامان حرب و جراحی، تعمیرات، فلکیات، علم نجوم اور دیگر کئی ایک سائنسی علوم پر دسترس رکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ یہ صورت حال پیدا ہوگئی کہ مسلمان سائنس دانوں کی نسبت اقوام دیگر کے سائنس دانوں نے کمال درجہ کی ترقی کی۔ وہ درجہ بہ درجہ آگے ہی بڑھتے رہے اور مسلمان انہیں دیکھ کر انگشت بدنداں ہوگئے۔ بقول اقبال ؂

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

کسی کی ایجاد کو استعمال کرنا کوئی بُرائی نہیں ہے لیکن اپنی صلاحیتوں کو صحیح طور پر استعمال نہ کر کے جمود کا شکار ہونا بُرائی ہے۔ مواصلات، آلاتِ حرب اور دیگر اشیاء ضروریہ انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔ ٹیلی فون، بلب، پنکھا، سائیکل، موٹر سائیکل، موٹر کار، پن گھڑی، دوربین، خوردبین، ٹی وی غرضیکہ بے شمار ایسی ایجادات ہیں جن سے لوگ کیسے بے نیاز ہو جائیں کیونکہ یہ ہماری روزمرہ زندگی میں انتہائی ضروری اور لازمی ہیں۔ لیکن مسلم دنیا میں جمود طاری ہونے کی وجہ سے فی زمانہ اقوام دیگر کی فکری کاوشوں پر گزارا کرنا پڑ رہا ہے جب کہ تحقیق اور ایجادات کرنے کے مواقع سب کے لیے برابر میسر ہیں۔ قرآن مجید کی سورۃ البقرۃ میں ہے: ''اللہ وہ ہے کہ اس نے جو کچھ کہ زمین میں ہے تم سب کے

لیے پیدا کیا ہے''۔ دراصل مسلمانوں نے اسلامی نظریات و افکار پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ سوچنے اور اپنی صلاحیتوں، قابلیتوں اور مہارتوں سے مدد لینے کا حکم دیا گیا تھا اور ایسا نہ کرنے والوں کے بارے میں قرآن مجید میں ارشادِ خداوندی ہے: ''ان کے دل ہیں لیکن وہ سوچتے نہیں، ان کی آنکھیں ہیں لیکن وہ دیکھتے نہیں، اور ان کے کان ہیں لیکن وہ سنتے نہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گئے گزرے یہ وہ لوگ ہیں جو غفلت میں گم ہو کر رہ گئے ہیں''۔

اسلامی تاریخ کے اوائل ہی سے ملوکیت اور عسکری جاگیرداری عالمِ اسلام کا مروجہ سیاسی اور معاشی نظام رہا ہے۔ یہ نظام بیسویں صدی کی ابتداء تک خلافت عثمانیہ کے زیرِ اثر قائم رہا ہے۔ اسی نظام کے تحت اموی، عباسی، عثمانی۔۔۔حکومتیں تیرہ سو سال تک قائم رہی ہیں۔ ابتداء میں معیشت کا کل دارومدار تجارت پر تھا جو کافی حد تک آج بھی قائم ہے۔ گویا کہ مسلم دنیا کی معاشی ابتداء دیگر اقوام سے خاصی مختلف ہے لیکن وہ اسلامی معیشت جس سے جدید دور کا عظیم معیشت دان اور فلسفی لینن بہت زیادہ متاثر تھا اپنی عملی شکل قائم نہ کرسکی۔ دنیا میں کوئی ایسی ریاست نہیں ہے جہاں اسلامی معیشت پر عمل کیا جاتا ہو۔ ہر اسلامی ریاست یورپی، امریکی اور دیگر معیشت کی مرہون منت ہے۔ ساٹھ (۶۰) سے زیادہ مسلم ممالک کا اتحاد پارہ پارہ ہے۔ سب تنہائی کا شکار ہیں۔ گٹھے سے نکلی ہوئی ایک ایک لکڑی کی طرح ٹوٹنے کے خوف سے سُکڑ رہی ہیں۔ حالات و واقعات کا استحصال کرنے والا مغربی معاشرہ ان سوکھی لکڑیوں کو ایک ایک کر کے توڑ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایجادات تو دور کی بات ہے مسلم تشخص شدید بحران کا شکار ہے۔

یورپ میں جاگیردارانہ زرعی نظام کے خاتمے کے بعد ابتداء میں تجارتی سرمایہ اور بعد میں صنعتی سرمایہ کو عروج حاصل ہوا۔ اس کے برعکس اسلامی دنیا میں تجارتی سرمایہ اور اس کے ارتکاز نے جاگیرداری اور عسکریت کو جنم دیا جس کی وجہ سے مسلم دنیا میں صنعتی انقلاب رو پذیر نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم سے قبل ہی مسلم دنیا مغربی، یورپی، امریکی اور بعد میں جاپانی صنعتی سامراجی تسلط کا شکار ہوگئی۔ فی زمانہ جاپان کے ساتھ چین سال انڈسٹری کی مصنوعات پھیلانے میں پیش پیش ہے۔ مسلم دنیا بڑے فخر سے ان مصنوعات کی تجارتی منڈی بن گئی ہے۔

مسلم دنیا تجارتی سرمایہ اور اپنی معیشت کے سنہری اصولوں پر فخر کرتی رہی ہے لیکن صنعتی میدان میں مکمل طور پر بانجھ پن کا شکار ہوگئی۔ صنعتی سرمایہ کاری نہ ہونے کی وجہ سے مسلم دنیا معمولی سے

معمولی شے بھی بدیسی اقوام سے منگوانے لگی۔آج کل پیپر پن سے لے کر بڑے بڑے جہاز تک ہر شے بدیسی استعمال کر کے مسلم ممالک خوشی محسوس کرتے ہیں۔

غیر مسلم اقوام نے صنعتی سرمایہ میں بے حد ترقی حاصل کی اس لیے وہ سائنسی سرمایہ یعنی سائنسی علوم میں بھی آگے نکل گئے۔مسلم ممالک جہاں صنعتی ایجادات خریدتے رہے وہاں عسکری برتری کے لیے سامانِ حرب خریدنے پر بھی مجبور ہوگئے۔روس اور امریکہ برسوں صنعتی کے بعد سائنسی سرمایہ کے میدان میں آپس میں مقابلہ کرتے رہے جب کہ مسلم ممالک ان کی سائنسی ایجادات، عسکری سامان اور صنعتی مشینری کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھنے لگے۔جدید سامانِ حرب اور دیگر سائنسی ایجادات کی خریداری کے لیے سیاہ سیال سونے اور دیگر کانوں کا منہ کھول کر مسلم ممالک نے اقوامِ دیگر کی تجوریاں بھرنی شروع کر دیں۔کہا جاتا ہے کہ سرمایہ اس کا ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں ہو لیکن مسلم ممالک کی بدقسمتی یہ ہے کہ سرمایہ ان کا ہے جب کہ کسی نہ کسی انداز میں اس پر قبضہ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کا ہے۔ ۹۱۔۱۹۹۰ء میں عراق پر حملہ کے سلسلہ میں امریکی وزیرِ خارجہ بیکر نے کہا تھا ''تیل ہماری تہذیب کی جان ہے اور ہم کسی شیطان کو اس پر قابض نہیں رہنے دیں گے''۔

تعلیماتِ اسلامی میں یہ قدر سنہری حروف میں درج ہے کہ اسلامی ممالک ایک جسم کی مانند ہیں۔ اگر کسی ایک عضو کو تکلیف ہو تو پورا جسم درد محسوس کرتا ہے لیکن ان تعلیمات کے برعکس ۱۶ جنوری ۱۹۹۱ء

> ٹیکنالوجی اور سائنس میں فرق ہمارے یہاں عموماً نہیں سمجھا گیا۔قدیم تہذیبوں میں ٹیکنالوجی ہوتی تھی سائنس نہیں۔ٹیکنالوجی، ٹیکنو سائنس، سائنٹزم الگ الگ اصطلاحات ہیں۔کسی تہذیب میں ٹیکنالوجی کا تعلق سرمایہ داری سے نہیں جڑا کیوں کہ سرمایہ داری موجود نہیں تھی۔جدید سائنٹفک ترقیات سرمایہ دارانہ نظام کے بغیر ممکن ہی نہیں اور یہ سرمایہ دارانہ نظام کیا ہے ہارورڈ کے اکنامکس کے پروفیسر کی تازہ کتاب The Acent of Money or the Cash Nexus پڑھ لیجیے بلکہ اس کی تلخیص بھی رسالے میں آجائے تو بہتر ہے۔نائل فرگوسن کی دو کتابیں بھی معرکتہ الآراء ہیں۔　　(خالد جامعی)

کی رات جب امریکی، برطانوی اور فرانسیسی جنگی ہوائی جہازوں نے عراق کے دارالحکومت بغداد پر بم

برسائے تو اگلی صبح وائس آف امریکہ، بی بی سی اور دیگر یورپی ریڈیو وٹی وی چینلز نے فخریہ لہجے میں اعلان کیا کہ عراق پر چارسو پروازیں کی گئیں اور ان پروازوں میں ہیروشیما پر گرائے ہوئے ایٹمی مواد کے برابر آتشیں بارود انڈیلا گیا۔ یہ خبر سن کر پورا اسلامی معاشرہ کانپ اٹھا لیکن اس کپکپی میں بہادری اور جرأت کا مظاہرہ کوئی نہ کرسکا۔

مسلمانوں کا اسلامی فکر کے مرکز سے دوری اور سائنسی وفکری سرمایہ کاری میں کمی کے سبب پورا عالم اسلام اپنے تشخص کے بحران کا شکار ہے۔ جدیدیت سے نفرت، تعصب اور قدامت پسندی بھی مسلمانوں کو حقیقی ترقی سے بہت پیچھے چھوڑ گئی ہے۔ مسلم قوم آج اپنی آفاقیت اور خصوصیت کھو کر آفاق میں گم ہوگئی ہے جس وجہ سے عالمگیر اخوتِ انسانی کے تصور کا خون ہو چکا ہے۔ یک طرفہ محدود سوچ نے سیاسی، عسکری، تجارتی، صنعتی اور سائنسی توازن بگاڑ دیا ہے۔

جتنی شد و مد اور باوقار انداز میں فرمانِ الٰہی میں جدید سائنس علوم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی تھی اتنی ہی شدت سے مسلمان اسلام سے دور ہوتے گئے۔ سائنسی ایجادات جو کسی حد تک ابتدائی زمانہ میں کی تھیں وہ وہیں کی وہیں رہ گئیں۔ الکندی، البیرونی، جابر بن حیان، ابن الہیثم اور دیگر مسلم سائنس دانوں کی سائنسی کاوشیں زنگ آلود ہوگئیں۔ وہ تمام نظریات جن کی ابتداء انہوں نے کی تھی، وہیں رک گئے جہاں سے شروع ہوئے تھے۔ مسلمانوں نے ان نظریات سے استفادہ نہ کیا لیکن غیر مسلموں نے انہیں اپنا کر کئی ایک ایجادات کیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ جدید ٹیکنالوجی کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے کی بجائے ان سے استفادہ کیا جائے اور خود بھی تحقیق کے میدان میں آگے بڑھا جائے تا کہ مسلمان بھی جدید دور کے مطابق وقت کے ساتھ چل سکیں۔ تعصب نہ کیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔ کوئی ایجاد بُری نہیں ہوتی اس کا استعمال بُرا ہوتا ہے۔ چھری سے خربوزہ اور سبزی کاٹی جاسکتی ہے اور کسی کا گلا بھی کاٹا جاسکتا ہے۔ کیڑے مار ادویات سے کیڑے مارے جاتے ہیں اس زہر کو پی کر کوئی بے وقوف خودکشی بھی کرسکتا ہے۔

مسلمانوں کو بھی وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا چاہیے۔ اجتہاد کا راستہ اپنانا چاہیے اور روایت اور قدامت پسندی کو چھوڑ کر جدیدیت میں قدم رکھنا چاہیے پھر ہی مسلم قوم سائنسی ایجادات کے میدان میں ترقی کرسکتی ہے بقول اقبال ؎

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا

کتابیات

۱۔ قرآن مجید
۲۔ مسلم فلسفہ، ڈاکٹر عبدالخالق/ پروفیسر محمد یوسف شیدائی
۳۔ مفکرینِ اسلام، عبید اللہ قدسی (انجمن اردو پاکستان، کراچی)
۴۔ پاکستان کے نامور سائنس دان، خالد محمود عاصم
۵۔ کلیات اقبال، علامہ محمد اقبال، اقبال اکیڈیمی، لاہور
۶۔ اسلام اور فلسفہ، خان محمد چاولہ، علمی کتب خانہ، لاہور

ماہنامہ ''الشریعہ'' گوجرانوالہ کی
خصوصی اشاعت
بیاد: ڈاکٹر محمود احمد غازی رحمتہ اللہ علیہ
(نامور اہل علم، معاصرین، تلامذہ اور متعلقین کے قلم سے عصر حاضر کے
ایک جید عالم اور محقق کے احوال وخدمات اور افکار وتحقیقات کا تذکرہ)

[صفحات تقریباً چھ سو۔ ہدیہ (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ) ۲۰۰ روپے]

....

برائے رابطہ: ناظم ترسیل ماہنامہ الشریعہ، جامع مسجد شیرانوالہ باغ، گوجرانوالہ
(0306-6426001)

۷۔ سائنس دانوں کے عظیم کارنامے، ترجمہ ڈاکٹر انیس الدین ملک، دارالشعور، لاہور
۸۔ Quran Studies Dr. Abdul Khaliq, Victory Book Bank, Lahore
۹۔ فلسفے کے بنیادی مسائل، قاضی قیصر الاسلام، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد
۱۰۔ ابن مسکویہ کا فلسفۂ اخلاق، جاوید اقبال ندیم، وکٹری بک بنک، لاہور
۱۱۔ سائنس دان کیسے بنتے ہیں؟ سید نظر زیدی، فیروز سنز، لاہور
۱۲۔ Encyclopedia World Book

خضر یاسین

اسلام اور جدید ٹیکنالوجی کا چیلنج

اسلام جن تہذیبی اوضاع کی تشکیل کرتا ہے اور جن تمدنی اقدار کو پیدا کرتا ہے، ان کے لیے جدید یا قدیم ٹیکنالوجی چیلنج کی حیثیت اختیار نہیں کرسکتی اس لیے کہ ٹیکنالوجی انسان کے حاصلاتِ علم کا استخدام ہے۔ انسان کی ذات کے تمام قویٰ اپنی ماہیت میں اچھے یا برے نہیں

ہوتے ، ان کو اچھائی یا برائی کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے اس طرح علوم کے حاصلات کا استخدام بھی اچھائی یا برائی کے کاموں میں کیا جاسکتا ہے، اگر چہ اصلاً وہ اچھائی یا برائی کے حامل نہیں ہوتے ۔اسلام کی تہذیبی اقدار اور تمدنی فضائل کے لیے جو مسائل چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں ان کا تعلق اپنی اصل کے اعتبار سے ''تصورِ انسان'' سے ہے ۔ زندگی اور کائنات کو مادے کے حوادث کا نتیجہ قرار دینے والا ذہن اپنے اعمال وافعال میں اسلام کے پیدا کردہ نظامِ اجتماع کے لیے صرف خطرہ ہی نہیں بلکہ تباہ کن خطرہ ہے ۔ یہ ذہن ایک ایسا مخلوط النسل اور مجہول النسب اجتماع قائم کرنے کا خواہاں ہے جو انسانوں کے لیے زیادے سے زیادہ جسمانی آسائش اور طبعی راحت وتسکین کا باعث ہو چاہے اس کی قیمت سوہانِ روح ہی کیوں نہ ہو۔ جدید ٹیکنالوجی اسی مادی حوادث کی پیداوار انسان کے ہاتھ میں جسمانی آسائش اور طبعی راحت وتسکین کا آلہ ہی نہیں ہے بلکہ اس انسانی اجتماع کی عمرانی اقدار کے لیے بھی چیلنج ہے جو اپنے ہستی کا جواز انسان کی پیدائش کے مقصد سے متعین کرتی ہیں ۔

انسان کی ذات کا مابہ الامتیاز وصف اقدار کا شعور اور حیثیتوں کے تعین میں فرق مراتب کا ادراک ہے ، جب اقدار کا شعور مادی وسائل کی افراط وتفریط سے اور حیثیتوں کا تعین مالی فراوانی سے عبارت ہونے لگے تو انسان جس مشکل کا شکار ہوتا ہے اس کا اندازہ لگانے آسان نہیں رہتا۔ جدید ٹیکنالوجی نے انسان کو اسی مشکل میں مبتلا کر دیا ہے ۔ شرم و حیا ، عفت و پاکیزگی ، طہارت غیرت کے کوئی معنی نہیں ہیں اس لیے کہ ان اقدار سے نہ مالی مفاد وابستہ ہے اور نہ ہی معاشرتی یا سماجی حیثیت احساس باقی ہے ۔ عریانی و فحاشی اس لیے برائی نہیں ہیں کیونکہ ان سے مالی مفادات وابستہ ہو چکے ہیں ۔ جدید ٹیکنالوجی نے انسانیت کے پورے نظام اقدار کو تلپٹ کر دیا ہے ، جس کے باعث مصلحین اور واعظین اس قدر بے اثر ہوکر رہ گئے ہیں کہ اس سے قبل انسانیت نے یہ تجربہ شاید کبھی نہیں کیا۔

اسلام انسان کے کسی ایسے عمل کو اپنے نظام اقدار میں کوئی مقام دینے کو تیار ہی نہیں جو انسان کے آزاد ارادے سے وجود میں نہ آیا ہو۔ خیر کی طرف انسان کا ہر قدم اندرونی اور بیرونی مزاحمتوں کا سامنا کیے بغیر نہیں اٹھ سکتا ، اس لیے موجودہ دور کی پیدا کردہ مزاحمتوں کو اسلام کے تصورِ خیر کے تحقق کے لیے سازگار ماحول کا درجہ حاصل ہے ۔ برائیوں کے ماحول

میں اچھائیوں کی طرف بڑھنا مشکل ضرور ہے مگر انسان کی اولوالعزمی کے ثبوت کی اس کے سوا کوئی دلیل بھی نہیں ہے۔قران مجید میں فرما گیا ہے:

احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا و ھم لا یفتنون o و لقد فتنا الذین من قبلھم فلیعلمن اللہ الذین صدقوا و لیعلمن الکذبین (۲۔۲۹)

کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ کہہ دیں کہ ہم ایمان لے آئے ، انہیں چھوڑ دیا جائے اور ان کا امتحان نہیں لیا جائے گا؟ o اور یقینا ہم آزمایا ہے ان سے پہلوں کو، پس اللہ ضرور جان کر رہے گا ان کو جو ایمان میں سچے ہیں اور انہیں جو جھوٹے ہیںo

ڈاکٹر مشتاق گوہر

بجلی سے چلنے والی منشیات

(The Plug-in Drugs)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی احادیث میں قیامت کی جو نشانیاں بتائی ہیں اُن میں یہ ذکر ہے کہ ''گھر گھر میں عورتیں ناچیں گی اور فتنہ ہر گھر میں گھس جائے گا۔'' آج ٹی وی سے زیادہ اس حدیث کا مصداق اور کوئی نہیں جس کے ذریعہ مسلمانوں میں غیر اسلامی باتیں انتہائی تیزی سے پھیلائی جارہی ہیں۔غیر مسلموں بالخصوص یہودیوں کا ایک مخصوص ایجنڈا ہے کہ مسلمانوں میں بے حیائی پھیلائی جائے

تاکہ ان میں ایڈز کے مریض کی طرح ہر غلط چیز کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ختم ہوجائے۔

حدیث رسول ﷺ ہے: ''میں تمہیں دجال کے متعلق ایسی بات بتاؤں گا جو مجھ سے پہلے نبیوں نے نہیں بتائی۔ وہ یہ کہ دجال کی ایک آنکھ ہوگی۔''غور سے دیکھیں تو ٹی وی، ویڈیو کیمرہ، کمپیوٹر (انٹرنیٹ) وغیرہ اور دجال میں ایک چیز قدرِ مشترک ہے اور وہ ہے ایک آنکھ۔ ٹی وی اور کمپیوٹر ہی ایک آنکھ والے دجال کے ایجنٹ ہیں جو ہر مسلمان کے گھر میں گھس کر فساد پھیلا رہے ہیں۔ یہ کوئی اتفاق نہیں کہ Times Worner جو ایک فلم کمپنی ہے اور CBS ان دونوں کا نشان ایک آنکھ ہے۔

قرآن میں شراب کے متعلق ذکر ہے کہ اس کے کچھ فائدے بھی ہیں لیکن اس کے نقصانات اس کے فائدوں سے زیادہ ہیں (سورہ البقرہ ۲۱۹:۲)۔ اسی لیے شراب حرام ٹھہرائی گئی۔ یہی حال ٹی وی کا بھی ہے کہ اس کا فائدہ کم اور نقصانات زیادہ ہیں۔ یہ درست ہے کہ ٹی وی پر تلاوت اور فہمِ قرآن کے پروگرام دکھائے جاتے ہیں مگر ان کے فوراً بعد بیہودہ اور لایعنی پروگرام پیش کر کے قرآن کے اثر کو فوراً زائل کر دیا جاتا ہے۔ پھر خود تلاوتِ قرآن کرنے اور ترجمۂ قرآن پڑھنے سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے وہ ٹی وی کے پروگرام دیکھنے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

ٹی وی اور خبریں

خبروں کے حصول کے لیے بھی ٹی وی کی افادیت محلِ نظر ہے۔ نیل پوسٹ مین (Neil Postman) امریکہ کا ایک بہت بڑا مفکر ہے اور امریکہ کی نیویارک یونیورسٹی کے کمیونیکیشن ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ ہے۔ اس نے اپنی کتاب How to watch TV news میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ٹی وی پر خبریں دینے کا اصل مقصد صرف لوگوں میں سنسنی پھیلانا اور اشتہارات (Advertisements) کا فروغ ہوتا ہے اور ریسرچ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ اخبارات پڑھتے ہیں وہ ان لوگوں کے مقابلے میں جو ٹی وی پر خبریں دیکھتے ہیں کہیں زیادہ ملکی حالات سے باخبر ہوتے ہیں کیونکہ اخبار میں خبر زیادہ تفصیل سے ہوتی ہے اور صفحے پر لکھی تحریر ٹی وی کی سکرین کے مقابلے میں زیادہ بہتر یاد ہوتی ہے۔

ٹی وی اور موسیقی

ٹی وی پر ہر وقت موسیقی دکھائی جاتی ہے حالانکہ نبی کریم ﷺ نے احادیث میں واضح طور پر

موسیقی کو حرام قرار دیا مثلاً ’الغناء ینبت النفاق فی القلب کما ینبت الماء الزرع‘(مشکوٰۃ باب الغناء) یعنی گانا بجانا دل میں منافقت کو اسی طرح اگاتا ہے جس طرح پانی کھیتی کو اگاتا ہے۔

ٹی وی ڈرامے

ٹی وی ڈرامے جن کے انتظار میں لوگ بے چین ہوتے ہیں اور اپنی روزمرہ کی خصوصاً شام کی مصروفیات کو ان ڈراموں کے اوقات کے مطابق ڈھالتے ہیں تاکہ ڈرامہ دیکھنے کا وقت نہ نکل جائے۔ یہ ڈرامے معیارِ زندگی بلند کرنے (یعنی ہمارے پاس فلاں چیز نہیں) کا درس دے کر لوگوں میں بے چینی پیدا کرتے ہیں اور انہیں مادہ پرست بناتے ہیں، مرد اور عورت دونوں کو جاب کرتا دکھا کر گھر میں خوشحالی کا تاثر دیتے ہیں اور اپنی مذہبی روایات سے بغاوت سکھاتے ہیں۔

ٹی وی کے نقصانات — جدید سائنسی تجزیہ

امریکہ کے اربابِ فکر ونظر نے ٹی وی کے نقصانات کا سائنسی تجزیہ کر کے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ ان میں نیل پوسٹ مین کی کتاب Amusing Ourselves to Death، جیری مینڈر کی کتاب Four Arguments for Elimination of Television اور میری ون کی کتاب The Plug-in Drugs (یعنی بجلی سے چلنے والی منشیات) شامل ہیں۔ جیری مینڈر کی تو اپنی اشتہارات کی کمپنی تھی جس کی اس نے ۱۵ سال تک سربراہی کی اور پھر ٹی وی کے بزنس سے توبہ کی اور گھر کا بھیدی ہونے کی حیثیت سے ٹی وی اور کمپیوٹر کی سیاہ کاریوں کے متعلق ایک تحریک شروع کی۔ اسی طرح ڈاکٹر Jane Healy ایک ماہر تعلیمی نفسیات ہے اور اس کا اس میدان میں ۳۵ سالہ تجربہ ہے۔ ان تمام محققین کی ریسرچ کی بنیاد پر مندرجہ ذیل نکات سامنے آتے ہیں:

۱۔ ٹی وی کی سکرین پر مناظر یا تصاویر (Images) سیکنڈ کے ۳۰ ویں حصے سے زیادہ تیزی کے ساتھ حرکت کرتے ہیں جس کی وجہ سے دماغ میں ان کو جانچنے اور پرکھنے (Analyze کرنے) کی صلاحیت نہیں ہوتی اور انسانی دماغ ان کی اچھائی اور برائی کی تمیز کیے بغیر ان کو اپنے اندر جذب (Passive Receptance) کر لیتا ہے۔

۲۔ امریکہ میں اعداد وشمار سے پتہ چلتا ہے کہ ایک عام امریکی شہری ہفتے میں ۳۰ گھنٹے ٹی وی دیکھتا ہے جبکہ والدین اپنے بچوں کو روزانہ ۱۵ منٹ سے بھی کم وقت دیتے ہیں۔ چونکہ مسلمان ممالک ہر چیز میں امریکہ کی اندھی تقلید کرتے ہیں اس لیے اس معاملے میں مسلمان والدین کا حال بھی یہی ہوگا۔

۳۔ پچھلے ۲۰ سالوں میں جیسے جیسے بچوں میں ٹی وی کا دیکھنا عام ہوا ہے اسی رفتار سے امتحانوں میں بچوں کی کارکردگی بد سے بدتر ہوئی ہے۔

۴۔ ٹی وی دیکھنا چونکہ ایک منفی (Passive) عمل ہے اس لیے اس کی وجہ سے لوگوں میں سستی کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ ماہرین نفسیات کی کئی سالوں کی تحقیق کا نچوڑ یہ ہے کہ لوگ جب ٹی وی پروگرام (ڈرامے اور فلمیں) دیکھتے ہیں تو وہ ان ڈراموں میں پیش کیے گئے حالات کو شعوری طور پر اپنی روزمرہ زندگی پر نافذ (Apply) کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں لوگوں میں جذباتیت کا رجحان اور ایک دوسرے کے لیے غصہ اور حسد کو بھڑکانے میں ٹی وی کا بہت دخل ہے۔

۶۔ ٹی وی اور کمپیوٹر جب چلتے ہیں تو ان کی سکرین میں سے کیتھوڈ شعاعیں (Cathod Rays) نکلتی ہیں اور یہ شعاعیں ہمارے دماغوں میں پیدا ہونے والی شعاعوں پر غالب آجاتی ہیں۔ اس کے نتیجے میں دماغ میں پیدا ہونے والی نیوروکیمیکلز (Neuro Chemicals) میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ اس کے سب سے مہلک اثرات چھوٹے بچوں اور ماں بننے والی خواتین پر پڑتے ہیں۔ چھوٹے بچوں میں توجہ مرکوز کرنے میں کمی کی بیماری (Attention Deficit Syndrome) میں سب سے زیادہ دخل ٹی وی کا ہے۔ اگر بچہ والدین کو تنگ کر رہا ہو تو ٹی وی کے آگے بٹھانے سے بچہ وقتی طور پر تو چپ ہوجاتا ہے مگر اس کی قیمت بعد میں دینی پڑتی ہے۔

۷۔ بیری سینڈر نے اپنی کتاب *In the absence of a Sacred* میں بتایا ہے کہ کینیڈا کے ایک شہر میں ریڈ انڈین قبائل آباد تھے۔ جن کا رہن سہن مسلمان معاشرے جیسا تھا یعنی اپنے بزرگوں کا احترام کرنا وغیرہ۔ وہاں کے سفید فام حکمرانوں نے ریڈ انڈین لوگوں کو اپنے جیسا بنانے

کے لیے کوشش کیں مگر نا کام رہے۔آخر انہوں نے ان ریڈ انڈین قبائل کو مفت ٹی وی تقسیم کیے اور وہاں کے ٹی وی چینل پر اسی طرح کے پروگرام نشر کیے جس طرح کے پروگرام پاکستان اور دیگر ممالک میں دکھائے جاتے ہیں۔ پھر کیا تھا کہ ۲۰ سالوں کے اندر اندر ریڈ انڈین قبائل کا معاشرتی نظام تباہ ہو کر رہ گیا۔ان کے نوجوانوں میں بے راہ روی پھیلنا شروع ہوگئی اور نوجوانوں نے اپنے والدین کے خلاف بغاوت کردی۔ جو کام دوسرے ذرائع نہ کر سکے وہ ٹی وی نے بڑی کامیابی سے کر دیا۔

۸۔ ٹی وی کی ماں یعنی کمپیوٹر کا بچوں کو سکھانا اور بچوں کا انٹرنیٹ پر chatting کرنا ایک قابلیت سمجھتی جاتی ہے حالانکہ اصل قابلیت تعلیم اور مطالعہ کتب سے آتی ہے۔کمپیوٹر تو برطانیہ اور امریکہ میں بن مانس بھی چلا لیتے ہیں۔

کیا ٹی وی چھوڑنا ممکن ہے؟

شروع شروع میں جب ٹی وی کو ایک بندہ چھوڑ دے تو سخت بے چینی ہوتی ہے کیونکہ یہ ایک قسم کا نشہ ہے جسے مَیری وِن نے بجلی سے چلنے والی منشیات کہا ہے۔ جب کسی نشہ آور چیز کو چھوڑیں تو وقتی طور پر تکلیف ضرور ہوتی ہے۔لیکن یقین جانیے کہ آپ ایک مہینہ ٹی وی چھوڑیں تو اس کے بعد آپ کا ٹی وی دیکھنے کو دل نہیں چاہے گا۔ اللہ اور نبی کریم ﷺ سے آپ کو اگر محبت ہے تو ان کی خاطر اپنا وقت ٹی وی پر برباد کرنا چھوڑ دیں۔حضور ﷺ نے فرمایا:

'من ترک شیئاً للہ عوضہ اللہ خیر اًمنہ' (الحدیث)

جو اللہ کی خاطر کوئی چیز چھوڑتا ہے تو اللہ اس کے بدلے میں اس سے بہتر چیز اس بندے کو عطا فرما دیتا ہے۔

ہم ٹی وی کو اپنی زندگی سے نکال دیں تو اس کے متبادل بہت سے مشغلے ہیں مثلاً:

۱۔ گھر میں سے کوئی ایک اسلامی کتاب پڑھے اور دوسرے اسی سنیں۔

۲۔ خود اسلامی کتاب یا اسلامی رسالہ پڑھیں اور جب دوسروں سے ملاقات ہو تو اس کتاب کے متعلق گفتگو کریں۔

۳۔ بچوں کو اسلامی کہانیاں سنائیں۔ یہ بات مسلم والدین کو بہت چھوٹی معلوم ہوتی ہے مگر بیسویں

صدی کے عظیم سائنسدان آئن سٹائن نے ایک مرتبہ کہا تھا: ''اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا بچہ ذہین بنے تو آپ اسے کہانیاں ضرور سنائیں۔''

کثرت حق کا معیار نہیں ہوتی۔ قرآن پاک میں ہے: ''ان سے کہہ دو کہ پاک اور ناپاک بہرحال یکساں نہیں ہیں خواہ ناپاک کی بہتات تمہیں کتنی کشش والی کیوں نہ معلوم ہو۔ پس اے لوگو جو عقل رکھتے ہو، اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو۔'' (المائدہ ۵:۱۰۰)

جب ۱۲۵۱ء میں تاتاریوں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجائی اور لاکھوں مسلمانوں کو قتل کیا تو اس وقت لگتا تھا کہ اب اسلام نہیں اٹھ سکے گا لیکن اس حادثے میں جو مسلمان زندہ بچ گئے انہی کی کوششوں سے وحشی تاتاریوں نے اسلام قبول کرلیا۔ آج پھر اسلام کو ایسے ہی افراد کی ضرورت ہے۔ مسلم والدین کو چاہیے کہ وہ ٹی وی پر وقت ضائع کرنے کی بجائے گھر میں درسِ قرآن کا اہتمام کریں۔ اپنے بچوں کو صحابہ کرامؓ اور مسلمان علماء (مثلاً امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام غزالیؒ وغیرہ) کی سوانح عمریاں سنائیں۔ یہ بات ہمیں بہت چھوٹی نظر آتی ہے لیکن سوانح عمریوں کے بچوں اور نوجوانوں کے ذہنوں پر بہت گہرے نقوش پڑتے ہیں۔ مشہور امریکی سائیکالوجسٹ Scott Peck نے اپنی کتاب *The Road less Travelled* میں لکھا ہے کہ بچوں اور نوجوانوں پر سوانح عمریوں کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے کیونکہ وہ غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی رول ماڈل کو ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں۔ جب ہم اپنے بچوں کو اسلامی رول ماڈل مہیا نہ کریں تو بچے اپنی ذہنی ضرورت کی وجہ سے ٹی وی یا فلموں سے کسی ایکٹر کو یا کسی کھلاڑی کو اپنا رول ماڈل بنا لیتے ہیں اور پھر اسی کی طرح بننے میں اپنی صلاحیتیں لگا دیتے ہیں۔ اللہ ہم سب کو ایک آنکھ والے دجالی فتنے خصوصاً ٹی وی، ڈش، کیمرہ، کمپیوٹر، انٹرنیٹ وغیرہ سے بچائے۔ آمین

خالد جامعی

موبائل فون ـــــ مضرات ونقصانات

اس سوال کا جائزہ کہ مسلمانانِ عالم اپنی تہذیب کی اسلامی خصوصیات کو تباہ کیے بغیر ان بے شمار مسائل سے کیوں کر نمٹ سکتے ہیں جنہیں حل کرنے کے لیے سائنس وٹیکنالوجی کی فنی مہارت نظر بظاہر ضروری نظر آتی ہے؟ کیا مغرب کے نظام اقدار کو الگ کرکے اس کی سائنس وٹیکنالوجی سے استفادہ ممکن ہے؟ کیا سائنس وٹیکنالوجی مجرد اشیاء ہوتی ہیں جن کا اقدار و روایت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا جب کہ مغرب کے بڑے بڑے فلاسفہ جدید سائنس وٹیکنالوجی کو ایک خاص فکر وتہذیب اور مابعد الطبیعیات سے وابستہ دیکھتے ہیں اور اسے عالم گیر تسلیم نہیں کرتے۔کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ مغربی سائنس وٹیکنالوجی جہاں جاتی ہے اپنی روایت، تہذیب، اقدار، اسلوب، رویے، طریقے اور طرزِ حیات بھی ساتھ لے کر جاتی ہے اور مقامی اقدار، روایات اور اسالیب حیات کو ختم کر دیتی ہے؟ کیا موبائل فون صرف ایک آلہ ہے یا ایک تہذیب، تمدن، ثقافت، تاریخ، زبان، بیان، اسلوب اور نیا طرز زندگی بھی ہے جس نے خیر وشر کے پیمانے بدل ڈالے ہیں، لوگوں کے سونے جاگنے کے اوقات کو زیر وزبر کر دیا ہے اور ان کی خلوت تک میں گھس کر گناہ کا دائرہ وسیع کر دیا ہے۔ SMS کے ذریعے ایک نئی زبان، نئی تہذیب، غلط رویے، غلیظ معاشرت، عامیانہ طرزِ گفتگو، بے ہودہ اشارے کنائے اور جملے ایجاد کیے ہیں، زبان و بیان کی نزاکت اور لطافت کو ختم کر دیا ہے اور سہولت کے نام پر زبان کا حلیہ بگاڑ دیا ہے تاکہ کم سے کم وقت میں، کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ یاوہ گوئی کی جاسکے۔ موبائل فون نے زبان سے، طرز گفتگو سے نفاست، طہارت اور شرافت کو رخصت کر دیا ہے۔ اس کی گھنٹیوں اور موسیقی نے خانہ کعبہ، مسجد نبوی، مساجد اور خانقاہوں کی پرسکون فضاء کو شدید متاثر کیا ہے، دنیا اور اس دنیا کے لغو اثرات مذہبی لوگوں پر بھی اس قدر حاوی ہوگئے ہیں کہ وہ ان مقدس مقامات پر آتے ہوئے اپنے فون کی گھنٹی بند کرنا بھول جاتے ہیں، یہ غفلت اور بے گانگی کی انتہا ہی نہیں، مساجد کے تقدس کی پامالی بھی ہے، مساجد میں مذہبی لوگ نماز کے اوقات میں باہر آکر فون سننے لگتے ہیں۔ اس فون نے اندرونی پرسکون دنیا کو تباہ کر دیا ہے اور اس وقت بھی جب ہم اپنے رب کے ساتھ تنہائی میں ہم کلام ہوتے ہیں، فون کی گھنٹی ان مقدس لمحات کو پراگندہ کر دیتی ہے۔ اس وقت

بھی یہ گھنٹی تباہ کن کردار ادا کرتی ہے جب ہم اپنی خلوتوں میں خود کلامی کی لذت سے لطف اٹھا رہے ہوں۔اس چھوٹے سے آلے نے ہمارے خیالات، افکار، معاملات،معمولات یومیہ، ذہن، قلب، فکر ونظر، نقطۂ نظر، طریقے، رویے، تعلقات سب کو بدل ڈالا ہے اور اس سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ہم میں سے کسی ایک کو بھی اس کی تاب کاری وتباہی کا اندازہ نہیں ہے۔ ہم تو سوچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے کہ اس آلے نے ہر شخص کو بخوشی آمادہ کر دیا ہے کہ وہ ہمہ وقت دنیا کے آفات وآلام سے پُر ہنگاموں، شورشوں، شور وشغب، سازشوں، دنیا پرستی، لذت طلبی، موج مستی، زر پرستی، شہوت انگیزی سے اپنی زندگی کا رشتہ خلوت وجلوت میں مسلسل جوڑے رکھے۔ یہ محض اتفاقی حادثہ نہیں ہے، اس حادثے نے روح انسانی کو کچل کر رکھ دیا ہے اور بڑے بڑے مذہبی لوگوں کو بھی نہایت سادگی و پرکاری سے بدل کر رکھ دیا ہے۔

موبائل فون نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد گرامی ''جو چپ رہا وہ نجات پا گیا'' کے نتیجے میں پیدا ہونے والے رویے، تہذیب، مزاج، اسلوب، شخصیت، انداز، مابعد الطبیعیات کو تباہ کر دیا ہے اور اب ہر شخص صرف باتیں کر رہا ہے، اس فون نے رات کو جلد سونے اور جلد اٹھنے کی اسلامی تہذیبی روایت کا بھی خاتمہ کر دیا ہے کیوں کہ سستے فون کی سہولت صرف رات بارہ بجے سے صبح فجر تک ہے۔ ہمارے دانشور اور مفکرین یہ بھی سوچنے سے قاصر ہیں کہ چند سال پہلے جب کراچی سے امریکا چند منٹ کا فون چھ سو روپے میں ہوتا تھا اب صرف دس روپے میں کیسے ہو رہا ہے؟ چند برس پہلے لاہور چند منٹ کی کال چالیس روپے میں ہوتی تھی اب دو سو روپے میں آپ پانچ ہزار منٹ بات کر سکتے ہیں۔ اس وقت پی ٹی سی ایل کا کاروبار محدود تھا لہٰذا لاگت زیادہ تھی حالانکہ منافع اس وقت بھی اربوں میں تھا، اب صارفین کی بے پناہ تعداد مصنوعی طور پر مہیا کر دی گئی ہے اور مختلف موبائل کمپنیوں نے فراد، فریب، دھوکہ دہی پر مبنی ایسے جھوٹے اشتہارات، اربوں روپے کے خرچ سے فضاء وہوا میں پھینک دیئے ہیں کہ لوگ اندھا دھند یہ اسکیمیں خریدتے ہیں اور اپنے مال اور قیمتی وقت سے بہ رضا و رغبت محرومی گوارا کر لیتے ہیں۔ امام شاطبیؒ نے الموافقات میں لکھا ہے کہ شریعت کو دین، عقل، نفس، مال اور نسل کی حفاظت مطلوب ہے۔ موبائل فون ان سب کا دشمن ہے۔ اس کے کچھ فوری فائدے اپنی جگہ لیکن فائدے تو شراب اور سود میں بھی ہیں، اس کا ذکر قرآن نے واضح الفاظ میں کیا

ہے اور کہا ہے کہ اس کے نقصانات اس کے فوائد سے بہت زیادہ ہیں۔ فائدہ اگر نہ بتایا جائے تو موبائل کون خریدے؟ شر میں بھی بہت سے فائدے ہیں لیکن اسلام میں کسی چیز کو قبول و رد کرنے کا اصول فائدہ نہیں مقاصد شریعہ کا حصول ہے۔ جو شے اس مقصد سے مطابقت رکھے صرف وہ ٹھیک ہے۔ صارفین نے بخوشی موبائل کمپنیوں کو اپنی متاع، معیشت، اوقات، خلوت، جلوت، غیرت، آبرو لوٹنے کی غیر مشروط اجازت دے رکھی ہے۔ جب پی ٹی سی ایل کے فون کے دام زیادہ تھے تو ہماری تہذیب، رویے اور عادات محفوظ و مامون تھے، ہمارے سرمایے کا زیاں تھا، لیکن اب جب فون کی لاگت برائے نام رہ گئی ہے لیکن اس سہولت کے نتیجے میں ہماری اقدار، روایات، تاریخ، تہذیب، رویوں، اخلاقیات کا جو حشر ہو رہا ہے، وہ قابل دید ہے۔ اسراف کی ثقافت نے پاکستانی معاشرے کا احاطہ کرلیا ہے۔ وہ لوگ جن کے گھروں میں پیٹ بھر کر کھانا میسر نہیں وہ بھی مسابقت کی دوڑ میں شرکت کے لیے اور اشتہارات سے متاثر ہو کر موبائل فون خرید رہے ہیں اور اپنے پاؤں اپنی چادر سے باہر نکال رہے ہیں۔ کم عمر لڑکے اور لڑکیاں اسکول، کالج، یونیورسٹی میں ہمہ وقت موبائل فون پر گفتگو کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس گفتگو کے لیے اتنا پیسہ کہاں سے آرہا ہے، ماں باپ سوچنے پر آمادہ نہیں کہ ان کی بچی کے موبائل فون کا خرچ کون ادا کر رہا ہے اور کس قیمت پر؟ کیا یہ گفتگو نہایت اہم اور ضروری ہے یا لغو اور لایعنی ہے؟ موبائل فون کلچر کے نتیجے میں کراچی کے نجی شفاخانوں میں ناجائز حمل گرانے کا کاروبار عروج پر ہے جہاں کالجوں کی لڑکیاں اپنے کالج کے لباس میں اسقاط حمل کے لیے جاتی ہیں اور اپنے زیورات، بُندے چوڑیاں دے کر اس گناہ کی قیمت ادا کرتی ہیں اور گھر جا کر تھانوں میں ڈکیتی اور چوری کی رپورٹ لکھواتی ہیں۔ ایک فون نے تاریخ، تہذیب، اقدار کا سفر معکوس کردیا ہے اور ہمارے مذہبی مفکرین اور جدیدیت پسند اب بھی سائنس کے قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ فرد معیشت، معاشرت، اخلاقیات، ایمانیات پر موبائل فون کے اثرات کا جائزہ ابھی تک نہیں لیا گیا ہے۔

ایران میں موبائل فون 75 ہزار روپے کا ہے۔ کیوبا میں کاسترو کے عہد تک موبائل فون پر مکمل پابندی تھی، صرف اعلیٰ سرکاری حکام کو محدود پیمانے پر استعمال کی اجازت تھی۔ اگر ایران اور کیوبا کے دانشور موبائل فون کے خطرات کا اندازہ کر سکتے ہیں تو ہمارے پاکستانی دانشور اور علماء اس آلے کو غیر

اقداری کیسے تصور کررہے ہیں؟ جس آلے نے تہذیب، تمدن، زبان، بیان، رویے، لہجے، اسلوب، طریقے، سلیقے، طرزِ حیات بدل ڈالے ہیں اسے اس قدیم اصول پر پرکھنا کہ ''جو اچھا ہے وہ لے لو اور جو خراب ہے اسے چھوڑ دو'' ایک احمقانہ پہلو محفوظ رہ سکتا ہے؟ اگر نہیں رہ سکتا تو اس کے تحفظ کے لیے کیا اقدامات کیے جاسکتے ہیں؟ کیا متبادل کا فلسفہ یہاں بھی لاگو ہوگا۔ پاکستان جیسے غریب ملک میں آٹھ کروڑ موبائل فون زیر استعمال ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی منڈی پاکستان کو قرار دیا گیا ہے اور موبائل کمپنیوں کا سب سے زیادہ کاروبار پاکستان میں ہے۔ کیا قیمتی قومی زرمبادلہ کو صرف بولو، بولتے رہو، جو چاہے بولو، کہو اور خوب کہو، دل کھول کر بولو، جیسے احمقانہ فلسفے کے فروغ کی خاطر تباہ کیا جاسکتا ہے؟ موبائل فون کے کثرت استعمال نے لوگوں کے میل جول، محبت آمیز تعلقات اور ملاقات کی روایات کو ختم کردیا ہے البتہ نوعمر لڑکے اور لڑکیوں کے میل جول کے سینکڑوں طریقے نکل آئے ہیں جو رفتہ رفتہ ناجائز جنسی تعلق میں تبدیل ہوکر، حرامی نسلوں میں اضافے کا سبب بن رہے ہیں ماں باپ موبائل فون کی آفتوں سے ناواقف ہیں یا بہت سادہ لوح ہیں۔ غریب لوگوں نے بھی فخریہ طور پر اپنے بچوں کو یہ فون دلا دیے ہیں، اس کے نتیجے میں ایک عجیب نسل پروان چڑھ رہی ہے، موبائل فیملی کے نام سے جعلی فیملی بنائی جارہی ہے جس کے اشتہارات اخبارات میں چھپ رہے ہیں۔ لڑکے لڑکیوں کو آوارگی، آبرو باختگی سکھانے کے لیے راتوں کو سستے سے سستے پیکج فراہم کیے جارہے ہیں، تاکہ وہ برقی جنسی نشے میں گرفتار ہوکر، موبائل کمپنیوں کے کاروبار میں اضافہ کریں اس نشے کی خاطر بچے ماں باپ کے پیسے چراتے ہیں، امیر رشتہ داروں کے گھروں میں چوریاں کرتے ہیں، دوستوں کا مال چوری کرتے ہیں اور اگر یہ راستے بند ہوجائیں تو اپنی عزت کا سودا کرنے پر بخوشی آمادہ ہوجاتے ہیں۔ موبائل کمپنیوں نے صرف 8 ہزار افراد کو روزگار فراہم کیا ہے لیکن اربوں روپے کا زرمبادلہ بیرون ملک منتقل کیا اور پاکستان کی مذہبی، تہذیبی، اخلاقی، اسلامی اقدار کو چند سالوں میں اس طرح تہس نہس کردیا ہے کہ اب کھربوں روپے خرچ کرکے بھی ان اقدار و روایات رویوں کی بحالی ممکن نہیں ہے؟ کیا موبائل فون مقاصد شریعت کے لیے سازگار موحول فراہم کررہا ہے؟ اس کے استعمال سے کیا ہمارے دین، عقل، نفس، مال اور نسل کی حفاظت ممکن ہے؟ اگر مقاصد شریعت کی حفاظت اس فون کے استعمال سے ممکن نہیں ہے تو کیا کیا جائے، کیا متبادل کے فلسفے پر عمل کیا جائے کہ آخر اس کا

متبادل کیا ہے؟ چند سال پہلے جب موبائل فون نہیں تھا اور اس سے پہلے ۱۹۷۰ء میں جب عام فون بھی لوگوں کو دستیاب نہ تھا تو زندگی کیسے بسر ہوتی تھی؟ ۱۹۷۳ء تک پاکستان میں فریج کی درآمد پر پابندی تھی تب لوگ برف اور فریج کے بغیر گرمیاں کیسے گزارتے تھے؟ (بشکریہ ماہنامہ بیداری)

ڈاکٹر محمد امین

ٹی وی یا اخلاقی ٹی بی

لاہور کی ایک سڑک پر گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہمارے ایک دوست کی نظر ایسی نوجوان لڑکی پر پڑی جس کے بال کٹے ہوئے تھے، دوپٹہ ندارد، ہونٹوں پر لپ اسٹک اور فیشن کے دیگر لوازمات بھی موجود۔ وہ ہم سے کہنے لگے ''کیا اس بے حیائی کا کوئی علاج نہیں؟'' ہم نے کہا ''نہیں'' کہنے لگے ''کیوں؟'' ہم نے کہا ''اس لیے کہ ٹی وی موجود ہے اور ٹی وی کے پیدا کردہ نئے کلچر کی رو سے بعض لوگوں کے نزدیک یہ سرے سے بے حیائی ہی نہیں''۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر کہنے لگے ''آخر ان جوان بچیوں کے بھائی ہوں گے، ان کے والد بھی ہوں گے کیا ان کو غیرت نہیں آتی کہ وہ اپنی جوان بیٹیوں، بہنوں کو اس روپ میں باہر بھجوادیتے ہیں''؟ ہم نے کہا ''نہیں آتی' آ ہی نہیں سکتی'' وہ جھنجھلا کر کہنے لگے ''کیوں نہیں آتی''؟ ہم نے کہا اس لیے کہ جب والد والدہ بیٹے بیٹیاں سب مل کر اکٹھے بیٹھ کر ٹی وی سے ایسے ڈرامے اور فلمیں دیکھیں گے جن میں مناسب لباس نہ پہنا گیا ہو، جن میں شریفانہ اور مہذب انداز میں گفتگو نہ ہو بلکہ عشق و محبت کے ڈائیلاگ ہوں اور نوجوانوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کے سامان ہوں اور بیٹی اپنے والد اور بہن اپنے بھائی کے ساتھ اکٹھے مل کر پروگرام دیکھیں تو پھر اس کی ضرورت اور گنجائش کتنی باقی رہتی ہے کہ والد بیٹی سے کہے کہ دوپٹہ لو اور بھائی اپنی بہن سے کہے کہ بن سنور کر باہر نہ نکلو۔

اب ایک دوسری تصویر دیکھئے۔ تزکیۂ نفس کی ایک محفل میں مربی نے اپنے ایک ایسے زیر تربیت فرد سے پوچھا جو عربی اور اسلامیات کے پروفیسر تھے کہ جناب آپ ٹی وی دیکھتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا ''جی''۔ پھر پوچھا ڈرامے بھی دیکھتے ہیں؟ کہا ''ہاں''۔ پھر مربی نے موضوع بدل دیا اور

دوسری باتیں ہونے لگیں۔ کافی دیر بعد جب مجلس برخواست ہونے کو تھی تو مربی نے کہا ’’پروفیسر صاحب! آپ سے ایک مسئلہ پوچھنا ہے تاکہ دوسرے لوگ بھی استفادہ کرسکیں‘‘ ’’جناب حکم‘‘! مسئلہ یہ ہے کہ غیر محرم عورت کو دیکھنا شرعاً کیسا ہے؟ ’’گناہ ہے‘‘ پروفیسر صاحب نے بلاتامل جواب دیا۔’’ اور اگر یہ غیر محرم عورت بنی سنوری اور غیر مناسب لباس میں بھی ٹی وی پر ہو تو پھر‘‘؟ مربی نے پوچھا۔۔۔اور پروفیسر صاحب کی نظریں جھک گئیں اور زبان گنگ ہوگئی۔

بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں کسی مقصد زندگی کا شعور نہیں۔ وہ زندگی گزار رہے ہیں اس لیے کہ وہ پیدا کردیے گئے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو ’’بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست‘‘ کے فلسفے پر یقین رکھتے ہیں۔ بے مقصدیت کا شکار ہیں دنیا میں جو آسائشیں میسر ہیں ان میں مگن ہیں اور جو میسر نہیں ان کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقے سے کوشاں ہیں۔ کچھ وہ بھی ہیں جو اسلامی اقدار اور اپنی روایات کو لایعنی سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ڈش انٹینا ترقی کا مظہر ہے۔ مغربی افکار و تہذیب پر مبنی ملکی و غیر ملکی پروگرام دیکھنا ایک عمدہ تفریح ہے۔ اس سے معلومات بڑھتی ہیں، ’اونچی سوسائٹی‘ میں موو کرنا آسان ہوتا ہے اور یہ بھی کہ ’’آخر اس میں بُرائی کیا ہے‘‘؟ آپ دنیا سے الگ تو نہیں رہ سکتے‘‘؟ اور ڈش کی مخالفت کرنا محض دقیانوسیت اور بنیاد پرستی ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس ملک میں ایک بہت بڑی تعداد اب بھی ان لوگوں کی ہے جو اسلامی تعلیمات کو برحق اور قابل عمل سمجھتے ہیں، وہ اسلامی اقدار پر خود بھی عمل کرنا چاہتے ہیں اور اپنی اولاد کے لیے بھی یہی خواہش رکھتے ہیں کہ وہ ان پر عمل کرے لیکن مشکل یہ ہے کہ ماحول ایسے لوگوں کے لیے سازگار نہیں ہے۔ مغربی تہذیب کا ریلا دندناتا ہوا ہمارے معاشرے میں گھستا چلا آرہا ہے اور اب تو ٹی وی کے ذریعے وہ ہمارے بیڈروموں میں گھس آیا ہے۔ آج سے پہلے یہ کیفیت تھی کہ جو ڈرامہ دیکھنا چاہتا اسے تھیٹر اور جو فلم دیکھنا چاہتا اسے سینما گھر جانا پڑتا تھا۔ پھر چوائس بھی اس کے پاس ہوتی تھی اگر کوئی اچھا کھیل یا فلم ہوتی تو وہ دیکھتا ورنہ نہیں دیکھتا۔ نئے ٹی وی کلچر نے یہ دونوں باتیں ختم کردی ہیں اب ڈرامہ اور فلم دیکھنے کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر گھر میں میسر ہیں۔ پھر موضوع کا چوائس بھی آپ کے ہاتھ میں نہیں رہا۔ جو ٹی وی کے کارپرداز چاہیں گے وہی آپ کو دیکھنا پڑے گا۔

پچھلے چند برسوں میں ٹی وی نے ہمارے دینی اور سماجی رویّوں اور ہماری تہذیبی اقدار کو جس طرح تبدیل بلکہ تباہ کیا ہے کاش کوئی اس کا حساب کتاب لگا سکے۔ ہمارے پاس یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے تو موجود ہیں لیکن اول تو ان کے پاس تحقیق کے لیے فنڈز نہیں، جو ہیں وہ صحیح طریقے سے خرچ

نہیں ہوتے، اور پھر زندہ اور نئے موضوعات پر تحقیق کرنے کی کسی کو سوجھتی نہیں۔ وہی گھسے پٹے موضوعات ہیں جن پر تحقیق کے نام سے لوگ مصروف رہتے ہیں۔ اس وقت فوری ضرورت اس بات کی ہے کہ ہماری کسی یونیورسٹی کا شعبہ ابلاغیات یا اسلامیات یا سوشل سائنسز کا کوئی بھی شعبہ اس موضوع پر پی ایچ ڈی سطح کی تحقیق کروائے کہ ٹی وی کے اثرات ہمارے معاشرے پر کتنے پڑے ہیں۔ ہمارے دینی تصورات، تعلیمی تخیلات، ہمارے تہذیبی رویے، ہمارے سوچنے سمجھنے کے انداز اور ہمارا کردار وعمل کتنا اس سے متاثر ہوا ہے؟ نئی نسل پر اس کے اثرات کتنے پڑے ہیں اور پرانی نسل پر کتنے؟

اس طرح کے تقابلی مطالعے کی بھی ضرورت ہے کہ سکول مسجد اور گھر کے اثرات کتنے ہیں اور ٹی وی کی مار کتنی گہری ہے۔ اس امر کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہمارے افراد خانہ تعلیم وتعلم اور تفریح کے دوسرے ذرائع پر کتنا وقت صرف کرتے ہیں اور ٹی وی پر کتنا؟ پھر اس مصروفیت کے جو اثرات ہماری سماجی زندگی پر پڑے ہیں وہ کتنے ہیں؟ اس امر کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ٹی وی پر جو کچھ دکھایا جاتا ہے اس میں تعمیری مواد کتنا ہوتا ہے اور غیر تعمیری کتنا؟ ایسا مواد کتنا ہے جو ہمارے قومی اور ملی مزاج سے ہم آہنگ ہے اور ایسا مواد کتنا ہے جو بدیسی تہذیب وفکر کی عکاسی کرتا ہے؟ اس امر کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہمارے کتنے لوگ انڈین ٹی وی، زی ٹی وی یا دوسرے غیر ملکی ٹی وی دیکھتے ہیں اور ان پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں بالمقابل ان لوگوں کے جو محض پاکستان ٹی وی دیکھتے ہیں؟ یہ دیکھنے کی ضرورت بھی ہے کہ ٹی وی نے ہمارے خیر اور شر کے معیارات کتنے بدلے ہیں اور ان پر اثر انداز ہونے کی اس کی کیفیت اور کمیت کتنی ہے؟ غرض اس مطالعے کے بہت سارے پہلو ایسے ہوں گے جو چشم کشا بھی ہوں گے اور فکر انگیز بھی بشرطیکہ کسی کو اس طرح کی تحقیق سے دلچسپی بھی ہو۔

ہم ٹی وی کے اثرات کے علمی اور تحقیقی پہلو کی طرف نکل گئے ورنہ درحقیقت جو بات اس سے اہم تر ہے وہ یہ ہے کہ جو لوگ ٹی وی کے شر سے بچنا چاہتے ہیں وہ کیا کریں؟ بعض لوگوں کے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ گھر میں ٹی وی نہ رکھا جائے۔ یہ ناممکن تو نہیں تاہم ہمارے زمانے میں ذرا مشکل بات ہے، الا یہ کہ آدمی کٹ ملائیت اور بنیاد پرستی کے طعنے سن سکنے کی ہمت رکھتا ہو اور اہل خانہ کی ایسی تربیت کرنے میں کامیاب رہا ہو کہ وہ اس کا ساتھ دیں ورنہ ہوتا یہ ہے کہ چھوٹے بچے ہمسایوں کے گھروں میں ٹی وی دیکھنے چلے جاتے ہیں جس سے بہت سے دیگر مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ بعض لوگ یہ صورت اختیار کرتے ہیں کہ بچوں کو اس بات کی ٹریننگ دیتے ہیں کہ وہ صرف بچوں کے اور

تعمیری پروگرام دیکھیں۔ یہ ایک مناسب حل ہے کیونکہ یہ قطعاً ضروری نہیں کہ بچے ہر وقت ٹی وی کے سامنے ہی بیٹھے رہیں بلکہ بچوں کی تربیت اوائل عمری ہی سے اس انداز میں کی جانی چاہیے کہ وہ صرف بچوں کے پروگرام دیکھیں یا وہ پروگرام جن کی اجازت والدین انہیں دیں۔ اس ضمن میں بنیادی ذمہ داری والدین کی ہے اگر والدین خود ہر وقت ٹی وی کے سامنے بیٹھے رہیں گے تو ظاہر ہے بچوں پر پابندی کیسے لگائی جا سکتی ہے؟ اس لیے ضروری ہے کہ والدین پہلے خود کو کنٹرول کریں، ٹی وی پر صرف ضروری اور تعمیری پروگرام دیکھیں پھر ہی وہ بچوں پر پابندی لگا سکیں گے۔

اس ضمن میں ایک بڑی ذمہ داری ان دینی عناصر پر بھی عائد ہوتی ہے جو معاشرے کی اصلاح کا دم بھرتے ہیں۔ ایسے لوگ جو جماعتوں، تنظیموں اور اداروں کی شکل میں منظم ہیں ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو ایسی تفریح مہیا کرنے کی کوشش کریں جس میں تخریب کا پہلو کم سے کم ہو۔ افسوس ہے کہ ہماری اسلامی جماعتوں اور اداروں نے اس معاملے میں آج تک انتہائی غفلت کا ثبوت دیا ہے۔ جو لوگ مغربی تہذیب اور سیکولرزم کے فریفتہ ہیں وہ تو الیکٹرانک ذرائع ابلاغ کے ذریعے اپنے نظریات کا خوب پرچار کر رہے ہیں لیکن دوسری طرف اسلامی انقلاب، اسلامی ادب اور اسلامی آرٹ کے نقیب ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں کوئی ان سے پوچھے کہ انہوں نے آج تک کتنی اصلاحی فلمیں بنائی ہیں؟ کتنے تعمیری ڈرامے تیار کیے ہیں؟ معصوم بچوں کے لیے اسلامی تصورات پر مبنی کتنی کارٹون سیریز تیار کی ہیں؟ الیکٹرانک میڈیا میں کام کرنے کے لیے کتنے افراد تیار کیے ہیں؟ یا ان کاموں کے لیے اب بھی ان کے پاس کیا پلاننگ ہے؟ جس زمانے میں ہم رہ رہے ہیں اس میں ایک عام آدمی کے لیے آسان نہیں ہے کہ وہ ٹی وی سے بچ سکے۔ ان حالات میں اصلاح کے علمبرداروں کا فرض ہے کہ اسلام دشمن طاقتیں یا مسلمان حکومتیں الیکٹرانک ذرائع ابلاغ کے ذریعے جو زہر مسلم عوام کی رگوں میں اتار رہی ہیں، وہ اس کے تریاق کا سوچیں بلکہ یہ تریاق انہیں مہیا کریں۔ ٹی وی تو آج ٹی بی کے جراثیم کی طرح جسدِ ملت کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ اگر اس کا تدراک نہ کیا گیا تو وہ وقت دور نہیں جب یہ جسد نحیف و نزار ہو کر ہر طرح کی بیماریوں کی آماجگاہ بن جائے گا اور خدانخواستہ وہ وقت بھی آ سکتا ہے جب اس کی بقا ہی خطرے پڑ جائے۔

ٹی وی تو ایک مشین ہے جس میں کوئی برائی نہیں۔ اگر ہم اس کا اچھا اور مفید استعمال کریں گے تو یہ اچھی چیز سمجھی جائے گی اور ہم اس کا غیر تعمیری استعمال کریں گے تو اسے بُرا سمجھا جائے گا۔ لہٰذا ملک کے ارباب بست و کشاد ٹی وی کے چینلز کے مالکان اور کارکنان سے یہ درخواست بے جا نہ ہوگی کہ وہ

اس ملک کے مسلمان عوام پر ترس کھائیں، انہیں مسلمان رہنے دیں اور انہیں اپنی تہذیبی اقدار سے بیگانہ مت کریں۔ ہمارے اسلاف نے یہ ملک اسلام کے نام پر بنایا تھا اور وہ اسے اسلام کی تجربہ گاہ اور اس کا مضبوط قلعہ بنانا چاہتے تھے لیکن ہمارے نادان حکمرانوں اور میڈیا کو نہ اسلام کی فکر ہے نہ نظریۂ پاکستان کی۔ ہمارے آئین کے مطابق ہماری ریاست کا فرض ہے کہ وہ مسلمانانِ پاکستان کو دینی تعلیمات پر عمل کرنے میں مدد دے اور اس کے لیے سازگار ماحول فراہم کرے لیکن اس کے برعکس یہ ہو رہا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے زندگی گزارنا دن بدن مشکل سے مشکل تر ہوتا جا رہا ہے اور دوسری طرف ہمارے حکمران اور دانشور ہیں جو مغرب کی تہذیبی اور فکری یلغار کے آگے بند باندھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے۔ وہ ٹی وی کے ذریعے اس سیلاب کو ہمارے گھروں کے اندر لے آئے ہیں۔ انہیں کون سمجھائے کہ جب نظریاتی دیواریں گر جاتی ہیں تو اینٹوں کی دیواریں دشمنوں کا راستہ نہیں روک سکتیں (نوائے وقت ٢٠ مئی ١٩٩٤ء)۔

محمد عاصم حفیظ
mah_skp@hotmail.com

میڈیا: برائی کی جڑ یا دعوت کا ہتھیار

میڈیا کی حیران کن ترقی نے دنیا بھر کی طرح پاکستان کو بھی شدید متاثر کیا ہے۔ اس نے ہر معاشرے کی طرح ہمارے ہاں بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ میڈیا کے طاقتور اثرات کی وجہ سے معاشرتی رویّے تبدیل ہوئے ہیں۔ جبکہ اس نے بعض روایات کو بدلنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ میڈیا کے معاشرے پر بے پناہ اثرات کی وجہ سے ہی آج کے دور کو 'ذرائع ابلاغ کا دور' قرار دیا جاتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کی مختلف صورتیں ہیں: الیکٹرانک میڈیا (ٹی وی چینلز، سی ڈیز اور دیگر ویڈیوز)، براڈ کاسٹ یعنی ریڈیو، سائبر میڈیا (انٹرنیٹ)، پرنٹ میڈیا (اخبار، رسائل) وغیرہ۔ اسی طرح موبائل فونز اور دیگر ذرائع پیغام رسانی کے ذریعے بھی ذرائع ابلاغ کا حصہ ہے۔ تعلقات عامہ جدید دور کا اہم ترین موضوع ہے اور اسی طرح میڈیا کے دیگر میدانوں کے حوالے سے بھی معلومات اور پیشہ ورانہ تربیت کا خاطر خواہ مواد موجود ہے۔ حکومتیں، ادارے، تنظیمیں اور مختلف افراد میڈیا کو اپنے پیغامات کی اشاعت، نظریات کے فروغ، سماجی اور ثقافتی تبدیلیوں حتیٰ کہ

بعض اوقات جنگی مقاصد کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ترقی یافتہ دنیا میں میڈیا کو باقاعدہ منصوبہ بندی سے استعمال کرنے کا آغاز کئی دہائیاں پہلے ہو چکا ہے تاہم ہمارے ہاں الیکٹرانک میڈیا اور انٹرنیٹ کی آمد کو ابھی چند سال ہی ہوئے ہیں ۔ یہ ایک نیا چیلنج ہے جس نے ہمارے معاشرے کے دیگر طبقات کی طرح دینی حلقوں کو بھی متاثر کیا ہے ۔ میڈیا کی روایتی پریکٹس اور تفریحی مواد کی زیادتی کے باعث اسے اسلام اور سماج مخالف سمجھ لیا گیا ہے اور بہت سے حلقے تو تمام تر برائیوں کی جڑ اسے ہی قرار دینے پر مصر ہیں ۔ ایسا لگتا ہے کہ دینی حلقوں میں یہ بات سرایت کر چکی ہے کہ میڈیا ہمارے معاشرے میں الحاد ، فحاشی، غیر اسلامی روایات اور ایسی ہی منفی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے تیار کردہ ایک سازش کا حصہ ہے اور اس سے صرف اور صرف وہی کام لیا جا سکتا ہے جو کہ آجکل پاکستانی ، بھارتی اور مغربی میڈیا پر نظر آ رہا ہے ۔شاید یہی وجہ ہے کہ دینی حلقے اس سے دور نظر آتے ہیں ۔ میڈیا کے خلاف تقریروں اور تحریروں کی بھرمار ہے حتیٰ کہ فتوے بھی سامنے آئے ہیں لیکن اس کے اثرات کم ہونے کی بجائے مزید بڑھتے ہی جا رہے ہیں ۔ تاہم کچھ مخلص حلقوں نے میڈیا کے میدان میں دینی حوالے سے سرگرمی دکھائی ہے اور شاید اسی لیے اب کہیں کہیں میڈیا کو سمجھنے اور اس کے درست استعمال کی کوششیں بھی نظر آتی ہیں۔حالات کی ٹھوکروں نے میڈیا کی اہمیت تو باور کرا دی ہے لیکن دینی طبقہ ابھی تک میڈیا کے بنائے ہوئے ماحول کو سمجھنے اور اس کی موجودہ پریکٹس میں اپنے لیے راہ تلاش کرنے میں ناکام رہا ہے۔اس تحریر کا مقصد میڈیا سے متعلق پائی جانے والی غلط فہمیوں کی وضاحت اور دینی طبقے کو ایک دعوت فکر دینا ہے ۔

یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر میڈیا ٹیکنالوجی کو دینی علوم رکھنے والے افراد مکمل پیشہ ورانہ اصولوں کے ساتھ استعمال کریں تو اسے تبلیغ دین کے لیے آسانی سے استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ چلیے ہم اس معاملے کو ایک مثال کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے بات واضح ہو جائے گی ۔ایک ہوائی جہاز آپ کو یورپ کے عشرت کدوں یا عیاشی کے اڈوں میں لے جا سکتا ہے اور وہی مکہ مکرمہ میں حج کے لیے بھی ۔فرق صرف یہ ہے کہ آپ نے کون سی سمت منتخب کی ہے اور پائلٹ کو کیا ہدایات دی ہیں ۔معزز علمائے کرام اور قارئین کرام ! میڈیا ٹیکنالوجی بھی ہوائی جہاز ،موٹر کاروں اور دیگر سہولیات کی طرح ایک ایجاد ہی ہے ۔جن آلات کو پیغام رسانی ، اپنے نظریات کے فروغ اور ان کو پھیلانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے اگر آپ ان کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کریں گے تو یہ آپ کا نظریہ اور پیغام ہر سو پھیلا دے گا اور اگر اس سے دور رہ کر محض تنقید سے کام

چلانے کی کوشش کی تو یہ اتنا طاقتور ہے کہ آپ کی آواز کو گمنام بنا دے گا یا آپ خود ہی اس کے اثرات کے سامنے خاموش ہو جائیں گے۔ ایک اور مثال لیجیے! کیا آج کے دور میں آپ نے کوئی ایسا نیک شخص دیکھا ہے جو مکمل خلوص اور صرف اور صرف ثواب کے جذبے کے تحت پیدل حج پر جانا چاہتا ہو؟ شاید نہیں ! کیونکہ علماء کرام سمیت ہر کوئی اسے جہاز یا کوئی اور تیز ترین ذریعہ استعمال کرنے کی تلقین کرے گا۔ آج ہم گاڑیوں، کمپیوٹرز اور ایسی ہی دیگر چیزوں سے صرف اس لیے دور ہونا پسند نہیں کریں گے کہ ان کا غلط استعمال بھی ہوتا ہے۔ یہی حال میڈیا ٹیکنالوجی کا ہے۔ یہ تو دعوت کو تیز ترین طریقے سے بڑے پیمانے پر پھیلا دینے کا ہتھیار ہے۔ اگر ملحدین اپنا پیغام پھیلانے کے لیے ایسا مواد تیار کر سکتے ہیں جو معاشرے میں بگاڑ کا باعث بنے تو اسلامی اصولوں کے اندر رہتے ہوئے ایسا مواد بھی تیار کیا جا سکتا ہے جس سے عقائد پر بھی فرق نہ آئے اور دعوت کا کام بھی ہو سکے۔ شرط یہ ہے کہ اس کا استعمال سیکھ کر آلات کو مرضی کے مطابق چلانا سیکھا جائے نیز سوچ بچار کے بعد اور بھرپور تیاری سے مواد کی تیاری کے لیے کام کیا جائے۔

اس مضمون کے ذریعے دینی طبقوں کو مخاطب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہی اشاعت اسلام کا بھرپور جذبہ رکھتے ہیں اور اس کے لیے اپنا وقت اور توانائیاں صرف کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں دین کی جو رہی سہی جھلک نظر آتی ہے وہ مسجد ومحراب کے ان وارثوں کی وجہ ہی سے ہے۔ مدارس کے پڑھے ہوئے علماء کرام ہی ہمارے معاشرے میں دین کی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس تحریر کا مقصد صرف ان کو اس بات پر راضی کرنا ہے کہ میڈیا کو تنقید کا نشانہ بنانے کے بجائے اس کو اپنے حق میں استعمال کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔ دعوت کے جذبے سے ان آلات کو اپنی آواز کفر کے ایوانوں میں پہنچانے کے لیے تصرف میں لایا جائے۔ یقین کریں کہ میڈیا سے دوستی آپ کے لیے انتہائی مفید ثابت ہو گی اور یہ آپ کی دعوت کو چارسو پھیلانے کا باعث بن سکتا ہے۔ میڈیا کے درست استعمال کے حوالے سے درپیش مسئلہ کو سمجھنے اور اس کو حل کرنے کے لیے منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ یہ واضح ہے کہ اسلام گوشہ نشینوں اور تارکِ دنیا افراد کا دین نہیں ہے۔ اس کے ماننے والے معاشرے کے فعال رکن بن کر جیتے ہیں۔ تو پھر دینی طبقہ کی جانب سے میڈیا کے میدان کو کیوں کھلا چھوڑ دیا گیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ کیا ابلاغ کا شعبہ معاشرے کی تشکیل میں شامل نہیں ہوتا؟ دینی دعوت کا کام سرانجام دینے والے لوگ اور تنظیمیں کیوں اس بارے میں غور نہیں کرتے۔ کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ یونیورسٹیوں میں ماس کمیونیکشن کرنے والے طلبہ جو ملکی نظام تعلیم کی

خرابیوں کے باعث دین کا کچھ زیادہ علم نہیں رکھتے وہی میڈیا کے میدان میں سب کی رہنمائی کریں؟ دینی طبقہ کیا ان سے معجزوں کی امید لگائے بیٹھا ہے؟ کیا یہ انتظار ہے کہ یہ لوگ میڈیا کو ایسا بنا دیں گے جو دین کی دعوت کے لیے اچھا ہو اور اس سے اسلام کی اشاعت ہو سکے؟ اگر ایسا ہے تو واقعی پریشان کن ہے۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ دینی علم اور ٹھوس علمی بنیاد کے بغیر صرف پیشہ ورانہ علم ہی کافی نہیں ہوتا اور میڈیا کی درست سمت کے تعین کے لیے دینی علم رکھنے والوں کو خود میدان میں آنا پڑے گا۔

اس تحریر کا مقصد کسی کو طعنے دینا نہیں ہے بلکہ کوشش صرف یہ ہے کہ دینی علوم رکھنے والے افراد میڈیا کی جانب متوجہ ہوں۔ یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ میڈیا کا خود اپنا کوئی نظریہ نہیں ہوتا بلکہ اس کو چلانے والے اپنے خیالات عام کرتے ہیں۔ اگر دینی لوگ اس کی باگ دوڑ سنبھالیں گے تو یقینا اسے ہدایت کا سرچشمہ بنایا جا سکتا ہے اور اگر کم دینی علم رکھنے والے یا بالکل ہی نابلد لوگوں کے ہاتھ میں میڈیا کی طاقت دے دی جائے تو پھر یقینا وہی کچھ ہوگا جو آپ آج دیکھ رہے ہیں۔ یونیورسٹی طلبہ کے پاس اچھی دینی معلومات تو ہو سکتی ہیں لیکن نظریاتی حدود کا خیال اور معاشرتی تبدیلیوں کی دینی لحاظ سے درست سمت کا تعین وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے باقاعدہ دینی علوم حاصل کر رکھے ہوں۔ میری مراد مدارس کے فضلاء اور وہ علما ہیں جو اصل دینی مصادر سے استفادہ کرتے ہیں اور احادیث کے علوم سے واقف ہیں اور جو غلط عقائد اور صحیح اسلامی احکام کے درمیان فرق کر سکتے ہیں۔ میڈیا کو تو اچھے بولنے والے چاہئیں۔ یہ واقعی المیہ ہے کہ اس وقت جو دینی پروگرام پیش کیے جا رہے ہیں ان میں ٹھوس دینی علم رکھنے والوں کی بجائے نیم دینی علم رکھنے والے لوگ غالب ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ مستند دینی حلقے اچھے اینکر اور ٹی وی پر اچھا بولنے والے افراد فراہم کرنے میں ناکام رہے ہیں جس کی وجہ سے یہ میدان جاوید غامدی اور ڈاکٹر عامر لیاقت جیسے لوگوں کو مل گیا ہے اور وہ اب دینی پروگراموں کو اپنے طریقے سے چلا رہے ہیں اور یہی حال ویب سائٹس، ایف ایم ریڈیوز وغیرہ کا بھی ہے۔ اسی طرح دینی طبقات میں اچھی کتابیں لکھنے کا رواج تو عام ہے لیکن میڈیا کے لیے مضامین نہیں لکھے جاتے۔ ہمارے ہاں حالات حاضرہ کو دینی نقطہ نظر سے زیر بحث لانے کا انتظام ہی نہیں۔ آپ کو سو یا اس سے بھی زیادہ کتابیں لکھنے والے علماء کرام تو مل جائیں گے لیکن کالم نگار اور، فیچر نگار علماء کی تعداد انتہائی کم ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ علماء کی کتابیں انہی کے حلقے کے لوگ تو ضرور پڑھتے ہیں یا پھر اچھا ادبی ذوق رکھنے والے طبقے پڑھ لیتے ہیں تاہم مسلک اور جماعت کی تفریق کی وجہ دوسرے لوگ کم ہی پڑھتے ہیں۔ جبکہ یہی علماء اگر اچھے

انداز سے میڈیا میں اظہار خیال کریں، کالم لکھیں، معاشرتی مسائل پر فیچر لکھیں تو نہ صرف زیادہ بڑا طبقہ مستفید ہوگا بلکہ لوگ دین کی طرف مائل بھی ہوں گے۔ حالات حاضرہ کو دینی نقطہ نظر سے زیر بحث لانے سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ علماء کرام کے بارے میں یہ غلط تاثر بھی دور ہوگا کہ وہ وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔

ایک بہت بڑی غلط فہمی یہ بھی ہے کہ الیکٹرانک میڈیا یعنی ٹی وی، فلم اور دیگر ویڈیوز کو ہی سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا ذرائع ابلاغ کا ایک طاقتور حصہ تو ضرور ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ اس کے بغیر پیغام رسانی اور نظریات کا فروغ ممکن ہی نہ ہو۔ ویسے تو بہت سے دینی حلقے کچھ حدود و قیود کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا کے قائل ہو چکے ہیں لیکن اگر کوئی جماعت اس کے بغیر ہی چلنا چاہے تو بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کے میدان میں آنے کے لیے بھرپور تیاری کی ضرورت ہے کیونکہ دینی تبلیغ کے لیے موجودہ رائج الوقت طریقے کارآمد نہیں ہوں گے۔ دینی جماعتوں کو چاہیے کہ الیکٹرانک میڈیا میں زور آزمائی سے پہلے دیگر شعبہ جات یعنی پرنٹ میڈیا (اخبارات و رسائل)، سائبر میڈیا یعنی انٹرنیٹ وغیرہ میں زیادہ کام کریں۔ کچھ عرصہ کی مکمل پیشہ ورانہ تربیت کے بعد الیکٹرانک میڈیا کی طرف آیا جائے کیونکہ یہ ایک مہنگا کام ہے اس لیے پیشہ ورانہ تربیت کے بغیر فنڈز ضائع ہونے کا بھی خدشہ ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انٹرنیٹ، پرنٹ میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ بھی کچھ کم اہمیت کے حامل نہیں ہیں اور اگر ان کو مکمل پیشہ ورانہ اصولوں سے استعمال کیا جائے تو ان سے انتہائی مفید نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ شرط صرف اور صرف یہ ہے کہ روایتی اور ڈنگ ٹپاؤ طریقوں سے ہٹ کر اس شعبے کی باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

پروپیگنڈا آج کے دور میں ایک مکمل سائنس کا درجہ حاصل کر چکا ہے اور اس کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے بھرپور تیاری کی ضرورت ہے۔ ایک وضاحت یہ بھی ضروری ہے کہ 'پروپیگنڈا' کے لفظ کو بھی میڈیا کی طرح صرف منفی معنوں میں ہی استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ اس سے مراد پیغام کو زیادہ سے زیادہ پھیلا دینا یعنی دعوت کو عام کرنا ہے۔ یہ منفی اور مثبت دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ کسی مضمون میں اس کی تکنیکس کے بارے میں بھی بتانے کی کوشش کروں گا۔ دعوتی سرگرمیوں سے منسلک علماء کرام کو ان سے متعلق جاننے کی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنا پیغام زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکیں۔ آج انتہائی سستے طریقے موجود ہیں جن کے ذریعے آپ اپنی بات سینکڑوں بلکہ ہزاروں لوگوں تک باآسانی پہنچا سکتے ہیں۔ سوشل نیٹ ورکنگ، ویب سائٹس، ای میلز،

ڈیلی نیوز لیٹرز، بلاگس، ویب سائٹس اور ایسی بہت سے چیزوں کے استعمال سے دعوتی سرگرمیوں کو ملکی بلکہ عالمی سطح پر پھیلایا جاسکتا ہے۔ اخبارات میں اچھے لکھنے والوں کے لیے ابھی بہت گنجائش موجود ہے جبکہ الیکٹرانک میڈیا میں بھی اچھے بولنے والوں کی ضرورت ہر وقت رہتی ہے۔ صرف اچھے رابطے کے ذریعے میڈیا گروپس سے فوائد حاصل کیے جاتے ہیں دینی طبقہ کے میڈیا کے میدان میں زیادہ اثر و رسوخ نہ ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مذہبی جماعتوں ،ان کی ذیلی تنظیموں ، بڑے دینی اداروں وغیرہ کے شعبہ اطلاعات سے منسلک افراد بھی میڈیا کی ورکنگ سے پوری طرح آگاہ نہیں اور شاید بہت سے مواقع پر تو اس عہدے کو صرف خانہ پری ہی سمجھا جاتا ہے۔ آج کے دور میں یہ انتہائی اہم عہدہ ہوتا ہے۔ دینی جماعتیں کسی اہم اور نامور عہدیدار کو ہی ترجمان اور اطلاعات کے شعبے کا انچارج مقرر کرنا پسند کرتی ہیں۔ اگر کسی بڑے نام کو ہی ترجمان مقرر کرنا مقصود ہو تو بھی کم از کم اس کی مدد کے لیے ہی کسی پروفیشنل کو مقرر کر دیں۔ ہم زندگی کے دیگر شعبوں میں ٹیکنیکل کاموں کے لیے ہنرمند افراد کی مدد لینا پسند کرتے ہیں لیکن شاید میڈیا کے لیے اس اصول کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ کیا ہم اپنی گاڑی کا ڈرائیور یا عمارت کا معمار بھی محض تعلق کی بنا پر مقرر کرنا پسند کریں گے؟۔ ہرگز نہیں کیونکہ ہمیں پتہ ہے کہ اگر ایسا کیا تو اناڑی ڈرائیور ضرور حادثہ کر دے گا اور اگر معمار ہنرمند نہ ہوا تو عمارت کو اس طرح بنائے گا کہ وہ جلد گر جائے گی۔ شعبہ اطلاعات اور تعلقات عامہ کو مضبوط اور ماہر افراد کی زیر نگرانی ہونا چاہیے کیونکہ اس کا درست استعمال آپ کی دعوت کو زیادہ تیزی سے عام کرے گا۔ اس حوالے سے ہر سطح پر مکمل منصوبہ بندی ہونی چاہیے کہ کس مسئلے پر کیا طریقہ کار اختیار کرنا ہے۔ کسی کے اخلاص پر شک نہیں کیا جاسکتا دینی جماعتوں کے شعبہ اطلاعات سے منسلک افراد یقیناً مخلص ہوتے ہیں اور اپنے طور پر بھرپور کوشش بھی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود مطلوبہ نتائج صرف اس لیے حاصل نہیں ہو پاتے کہ منصوبہ بندی اور پیشہ ورانہ مہارت کی کمی ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ بہت سی دینی جماعتوں اور رہنماؤں کو یہ اعتراض بھی ہے کہ میڈیا انہیں کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا اور اس کا زیادہ فوکس سیاست اور دیگر تفریحی مواد کی طرف ہوتا ہے۔ اس اعتراض سے پہلے یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ کیا کسی دینی جماعت نے میڈیا کی تربیت کے حوالے سے کوئی ادارہ قائم کیا ہے؟ کیا میڈیا میں موجود افراد سے تعلقات بڑھانے اور ان تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے کوششیں کی گئی ہیں؟ کیا دینی جماعتوں نے باقاعدہ ایسے افراد تیار کیے ہیں جو میڈیا پر مخالفانہ پروپیگنڈے کا جواب دے سکیں؟ کیا میڈیا کے لیے مواد کی فراہمی اور موجودہ پیش کیے جانیوالے

مواد کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں متبادل مواد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے؟ اگر ایسا نہیں ہو سکا تو پھر اعتراض کیسا؟ جب کچھ بویا ہی نہیں گیا تو کیا کاٹنے کی امید کی جا رہی ہے؟ اگر آج میڈیا پر لادینیت اور سیکولرازم غالب نظر آتا ہے اور ایسی چیزوں کی بہتات ہے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہیں تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عالمی سطح پر اسلام مخالف اداروں نے اس کے لیے بھرپور کوششیں کی ہیں۔ ایسے ادارے موجود ہیں جو مکمل منصوبہ بندی کے ذریعے میڈیا پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ریسرچ سینٹرز قائم کیے گئے ہیں، سروے رپورٹس اور انکشافات کے ذریعے میڈیا کو ایک خاص لائن فراہم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسلام مخالف ادارے میڈیا سے منسلک ہنرمند اور تجربہ کار افراد کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور ان کی رہنمائی میں ایسا مواد تیار کیا جاتا ہے جو بظاہر تفریح، کھیل یا کسی بھی اور مقصد کے لیے ہوتا ہے لیکن اس کا پوشیدہ مقصد معاشرے میں لادینیت پھیلانا ہوتا ہے۔ میڈیا پر اس مواد کی اشاعت کے لیے سپانسرز ڈھونڈے جاتے ہیں اور ایک نیٹ ورک کے ذریعے اسے عام کر دیا جاتا ہے۔ ہیری پوٹر سیریز اور انڈین چینلز کے ڈرامے اس کی مثال ہیں۔ ہیری پوٹر سیریز میں جادو وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کی کتاب مارکیٹ میں آتی ہے، چینلز اس کی کوریج کرتے ہیں، پھر فلم بنائی جاتی ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں اس کی ایڈ بناتی ہیں، اس نام کے کھلونے اور دیگر سرگرمیاں سامنے آتی ہیں۔ غرض ایک مکمل منصوبہ بندی کے ذریعے اسے پوری دنیا میں پھیلا دیا جاتا ہے۔ یہی حال انڈین ڈراموں کا ہے۔ ان میں ہندو مذہب کی بھرپور تبلیغ کی جاتی ہے۔ خواتین کے لباس کے ایسے ڈیزائن متعارف کرائے جاتے ہیں جو بے حیائی کا باعث ہوں۔ تاجر فوری طور پر اس قسم کے ڈیزائن کردہ لباس بازار میں لے آتے ہیں اور اس طرح ایک منصوبہ بندی کے ذریعے مقصد حاصل کیا جاتا ہے۔ اگر ہمیں میڈیا کو دینی تبلیغ اور اسلامی روایات کے فروغ کے لیے استعمال کرنا ہے تو اس کے لیے اسی قسم کی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے۔ دینی جماعتوں کو میڈیا کے میدان میں کچھ بونے کی ضرورت ہے تاکہ اس کی فصل معاشرے میں پھیلنے والے اثرات کی صورت میں کاٹ سکیں۔

مسئلے کو صرف محفلوں میں زیر بحث لانا اور استغفر اللہ اور نعوذ باللہ کا ورد کرتے ہوئے میڈیا میں کام کرنے والوں کو بے دین اور اسلام مخالف قرار دینا بھی مناسب نہیں۔ کیونکہ اس سے پریشانی حل نہیں ہوگی بلکہ خلیج بڑھتی جائے گی۔ اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ میڈیا میں کام کرنے والے بہرحال مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے اور ہمارے اسی مسلم معاشرے میں پروان چڑھے ہیں۔ یقین کریں کہ ان میں سے کسی کا بھی تعلق بھارت یا ہندوازم سے نہیں ہے اور نہ ہی ان کی تربیت

امریکہ، یہودی تنظیموں یا اسلام مخالف گروہوں میں سے کسی نے کی ہے۔ یہ اسی معاشرے کے ایسے فرد ہیں جنہیں نظام تعلیم کی خرابی، دینی طبقے سے رابطے کے فقدان، مخصوص معاشرتی ماحول اور دیگر عوامل نے موجودہ مقام تک پہنچا دیا ہے۔ بات تو تلخ ہے لیکن تسلیم کرنا چاہیے کہ ان لوگوں کو دینی طبقہ میڈیا کے میدان میں کوئی خاص رہنمائی فراہم کرنے میں ناکام رہا ہے اور اب یہ لوگ مغرب اور بھارتی ثقافت میں رنگے نظر آتے ہیں۔ دینی جماعتیں اور حلقے یہ ہی کیوں چاہتے ہیں کہ سب لوگ خود بخود ہی چل کر ان کے پاس آئیں اور آکر رہنمائی کی درخواست کریں۔ اس بات پر کیوں غور نہیں کیا جاتا کہ دعوت کا فریضہ تو بہرحال آپ کو ہی سرانجام دینا ہے۔ اگر آپ اپنی دعوتی سرگرمیوں کو اچھے طریقے سے سرانجام دیں گے اور مضبوط نیٹ ورک بنائیں گے تو معاشرے کا بڑا طبقہ بشمول میڈیا آپ کے پاس آئے گا اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو یقینا مخالفین حاوی نظر آئیں گے اور محض مساجد میں دیے گئے وعظ اور خطبات کام نہ آسکیں گے۔ دینی تعلیمات سے ہٹ کر زندگی گزارنے والوں کو بھی بہرحال کسی صورت بری الذمہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس بحث کا مقصد صرف یہ ہے کہ نظریات کے اس تصادم میں اسلام کی دعوت کے امین اور صاحب علم دینی حلقوں کو کچھ زیادہ محنت کرنے کی ضرورت ہے اور خاص کر میڈیا کے میدان میں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب بھی اس سمت میں کوئی سنجیدہ کوشش ہوئی تو یہی نوجوان نسل کہ جسے دین بیزار سمجھا جاتا ہے وہ ہی ہراول دستہ ثابت ہوئی۔ کشمیر اور فلسطین کی تحریک آزادی میں یونیورسٹی طلبہ کا ایک بڑا کردار ہے۔ انٹرنیٹ پر تبلیغ میں بھی بڑا حصہ ایسے افراد کا ہے جو شاید کبھی کسی مدرسے نہ گئے ہوں۔ یہ علماء کرام کی کتابوں کی تشہیر کرتے ہیں اور مطالعہ کر کے دلائل ڈھونڈتے ہیں۔ دینی طبقے کو میڈیا سے منسلک افراد سے رابطے بڑھانے کی ضرورت ہے۔ دینی اور نظریاتی افراد کو بھی پیشہ ورانہ مہارت حاصل کر کے میڈیا کے اداروں میں داخل کرایا جا سکتا ہے۔

اس مضمون کا مقصد دعوت فکر تھا کہ ہمیں میڈیا کے میدان میں ذرا تیز رفتاری سے آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ بالکل کام ہی نہیں ہو رہا۔ بہت سے حلقے کوششیں کر رہے ہیں اور ان کے کچھ مفید نتائج بھی نکلے ہیں۔ صرف یہ ہے کہ کام منظم نہیں ہے۔ ایسا سمجھ لینا کہ لوگ میڈیا کے ذریعے دین کی دعوت کو سننا ہی نہیں چاہتے بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ یہ میڈیا ہی ہے جس کے باعث آج ڈاکٹر ذاکر نائیک کو پوری دنیا جانتی ہے۔ ڈاکٹر فرحت ہاشمی عالمی سطح پر پہچان رکھتی ہے۔ بہت سی اسلامی تنظیموں نے ایسا مواد تیار کیا ہے جو واقعی پُرکشش ہے اور اس کی وجہ سے ہی بہت سے

لوگ مسلمان بھی ہوئے۔ انٹرنیٹ تبلیغ کا بہت بڑا ذریعہ بن چکا ہے اور یورپ و امریکہ میں اتنے لوگ اس کے ذریعے مسلمان ہوئے ہیں جن تک پہنچنا شاید ویسے ممکن ہی نہ ہوتا۔ ایک رپورٹ کے مطابق سعودی عرب کی موبائل ایس ایم ایس سروس سے کئی ہزار لوگ مسلمان ہو چکے ہیں۔ فلسطینی تنظیم حماس اور لبنان میں حزب اللہ نے اپنے مقاصد کے لیے میڈیا کو بھرپور طریقے سے استعمال کیا ہے۔ انہوں نے متعدد مواقع پر یہودی اور مغربی میڈیا کو شکست دی ہے۔ یہ لوگ انتہائی مہارت سے میڈیا کو اپنے حق میں استعمال کرتے ہیں۔ ایران میں بھی میڈیا کی روایتی پریکٹس سے ہٹ کر متبادل فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اگر یہ سب منظم طریقے سے ہونے لگے تو کافی زیادہ اچھے نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں

یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ وقتی طور پر کسی گروپ کا غلبہ دیکھ کر پریشان نہ ہوا جائے۔ ایسا تو انبیاء کے دور میں بھی نہیں ہوا کہ سب لوگ ہی ہدایت یافتہ ہو گئے ہوں۔ یہ مقابلے کی دنیا ہے، ہر گروہ کو اپنا اپنا کام کرنا ہوتا ہے۔ میڈیا معاشرتی تبدیلی کا طاقتور ترین ہتھیار ہے اور دعوت کے میدان میں اس کی ضرورت بڑھتی جا رہی ہیں۔ اس لیے دینی طبقے کے لیے ضروری ہے کہ وہ میڈیا سے دور رہنے کی پالیسی کو تبدیل کر کے اسے اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوششوں کا آغاز کرے۔

ڈائیلاگ

خالد جامعی

علوم نقلیہ وعقلیہ کی تعلیم

البرہان کے پچھلے شمارے میں آپ نے علی گڑھ اور دیوبند کو متحد کرنے کی سرخی لگائی ہے۔ دینی مدارس سے ملحق مکاتب فکر کو صرف دیوبند کی اصطلاح سے واضح کرنا مناسب نہیں کہ اس کے نتیجے میں

عصبیت پیدا ہوتی ہے جب کہ آپ تو ماشاء اللہ تمام مکاتب فکر میں اتحاد کے لیے عمدہ کام کر رہے ہیں لہٰذا ایسے موضوعات سے گریز ضروری ہے۔

علی گڑھ اور دیوبند میں فاصلے کم کرنے کی باتیں بظاہر بہت خوبصورت ہیں لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا دونوں اداروں کی ما بعد الطبیعیات اور اساسات ایک ہیں؟ فلسفے کی دنیا میں اگر مابعدالطبیعیاتی اساسات ایک ہوں تو دو مختلف فلسفے مدغم ہو سکتے ہیں لیکن اساسات مختلف ہوں تو ان کا ملاپ ممکن نہیں ہوتا۔ یہی صورت حال سائنس کی دنیا کی ہے نیوٹن اور آئن سٹائن کی سائنس کی اساسات مختلف ہیں لہٰذا دونوں کے منہاج مختلف ہیں اور ان کا ادغام ممکن نہیں۔ علی گڑھ کیا تھا اس کے لیے ضیاء الدین لاہوری کی دو کتابیں افکار سرسید اور حیاتِ سرسید کا مطالعہ فرمالیجئے ان میں صرف سرسید کی اصل تحریروں کے حوالے ہیں۔

اسلامی تاریخ میں علوم وفنون کا طریقہ کیا رہا؟ عہد حاضر میں فنون نے علوم کی جگہ لے لی ہے یا کم از کم علم وفن برابر ہو گئے ہیں مثلاً شریعت اور سائنس — سائنس فنون آرٹ کرافٹ وغیرہ تمام تہذیبوں میں علوم کی تلچھٹ تصور کیے گئے ہیں لہٰذا جب آپ علی گڑھ اور دیوبند کو ملانے کی بات کرتے ہیں تو اصلاً آپ دونوں علوم یعنی نقلیہ اور علوم عقلیہ کو یکساں مرتبے اور مقام پر فائز کرتے ہیں۔ خواہ یہ عمل نادانستہ ہو لیکن عملاً ایسا ہی ہے۔ کیا دونوں علوم کی حیثیت ومرتبہ مساوی ہے؟ یہ بات واضح ہونی چاہیے۔ روایتی تہذیبوں میں فنون کرافٹ آرٹ وغیرہ کیسے حاصل ہوتے تھے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے۔ سائنس کا علم ہر ایک کو کیوں پڑھایا جائے؟ دینی علم ضرور ہر ایک کو پڑھایا جائے کہ یہ لازمی ہے اور فنون ہر شخص کی استعداد کے مطابق سکھائے جائیں۔ ذہین طلبہ کو منتخب کر کے سائنسی علوم پڑھائے جائیں اور یہ ہر ایک کے لیے عام نہ ہوں۔

جب آپ کہتے ہیں کہ دونوں کی خوبیوں وخامیوں کو رفع وجمع کرنا چاہیے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ علوم نقلیہ میں بھی خامیاں ہیں اور علوم عقلیہ میں بھی خامیاں ہیں۔ ظاہر ہے آپ کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے لیکن مطلب یہی سمجھا جاتا ہے۔

البرہان: ہم جب علی گڑھ اور دیوبند کو (دو تعلیمی نظاموں کے نمائندہ اداروں کی حیثیت سے) قریب لانے اور ملانے اور دونوں کی خوبیوں کو لینے اور خامیوں کو ترک کر دینے کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہمارے پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ موجودہ تعلیمی شنویت ختم کی جائے جو مضر بھی ہے اور اسلامی